توجہ نہ فرمائی تو میں بھی جائنٹ سکریٹری کے عہدہ سے استعفا دیدوں گا۔ بلکہ ہر ایک
تعلق سکریٹریٹ آفس سے علیحدہ ہو جاؤں گا"

اسی طرح سرسید کے جو رفقا زندہ تھے اُنہوں نے خانگی اور ضابطہ کے خطوط میں
سخت اصرار کیا اور ہر قسم کا ذاتی اثر ڈالا۔ اس نوبت پر نواب صاحب مجبور ہو گئے اور
بقیہ میعاد تک کے لئے استعفا واپس لے لیا۔ لیکن آیندہ انتخاب کے لئے معذرت کی۔

دوبارہ انتخاب اور ایک اصولی سوال کا تصفیہ

جب دوبارہ انتخاب کا وقت آیا تو عام و خاص نظریں
ان ہی پر تھیں اور ۳۱ جنوری ۱۹۰۲ء کو جو اجلاس
ہوا تو اس میں نواب وقار الملک نے عام خواہش کی
اس طرح ترجمانی کی کہ "حقیقت یہ ہے کہ قوم اس وقت ایک سرے سے لیکر دوسرے سرے
تک نواب محسن الملک ہی کے بہ لحاظ ان کی نہایت بیش بہا خدمات کے اس عہدہ پر رہنے
کے واسطے آرزومند ہے اور ہم لوگ جو اس قومی کالج کے ٹرسٹی ہیں ہماری حالت بمنزلہ
قوم کے وکلا کے ہے اور ہمارا یہ فرض ہے کہ اس وقت ہم اُس ہر دلعزیزی کے لحاظ سے
جو نواب صاحب ممدوح کو قوم میں حاصل ہے ان ہی کو دوبارہ منتخب کرنے کے لئے ووٹ
دیں۔ اس وقت ہمارا یہ طرز عمل جو درحقیقت ایک اعتراف نواب صاحب ممدوح کی نہایت
قیمتی خدمات کا ہے آیندہ ان لوگوں کی ہمّت افزائی کا بھی ایک موجب ہوگا جو قومی
خدمات پر اپنے آرام و آسائش کو قربان کریں اور خود قوم کے لئے یہ افتخار و عزت کی بات
ہے کہ وہ اپنے محسن کے احسانات کی قدرشناسی عملی طور سے کرے۔ غرض کہ ہر ایک
حیثیت سے میرے نزدیک نواب محسن الملک کو دوبارہ اس عہدہ کے لئے منتخب کرنا ہمارے
قومی فرائض میں سے ہے۔

چنانچہ نواب صاحب بلا اختلاف سکریٹری منتخب ہوئے لیکن اُنہوں نے جبتک
کہ یہ اصولی مسئلہ کہ آنریری سکریٹری پولیٹیکل مسائل میں حصّہ لے سکتا ہے طے نہ ہو جائے

اپنا انتخاب منظور نہیں کیا۔ جلسہ کے بعد اس تمام کیفیت سے ہز آنر کو اطلاع دی گئی۔ اب صوبہ کی عنانِ حکومت سر جیمس لاٹوش کے ہاتھوں میں تھی جن کی ہمدردی اور شرافتِ نفس پر ہر شخص کو اعتماد تھا۔ ان کو کالج کے خالص خیر خواہوں اور بہی خواہوں کے بے شمار خطوط[1] موصول ہوئے جن میں صرف یہی خواہش و امید تھی کہ نواب محسن الملک مستعفی نہ ہوں اور دوسری مدت کے لئے بھی سکریٹری کا عہدہ قبول کریں۔"

ہز آنر سر جیمس خود کالج میں تشریف لائے ٹرسٹیوں سے پرائیویٹ گفتگو کی، اس ملاقات میں نواب محسن الملک نے ان اسباب و وجوہ کو جو اس عہدہ کو قبول کرنے میں مانع تھے نہایت وضاحت سے بیان کیا اور آخر میں کہا کہ علاوہ کالج کے اور بھی قومی کام ہیں اور اکثر قومی حقوق کی حفاظت میں حصہ لینے اور پولیٹیکل مسائل جو مسلمانوں سے متعلق ہیں ان میں شریک ہونے کی ضرورت ہوتی ہے اگر کالج کا سکریٹری صرف سکریٹری ہونے کی وجہ سے اس میں بطور خود بھی حصہ نہیں لے سکتا اور شریک نہیں ہو سکتا تو وہ سکریٹری ہونا منظور نہیں کر سکتے لیکن اگر اس کو آزادی ہے اور اپنی رائے اور منشا کے موافق وہ اس میں حصہ لے سکتا ہے اور ایسی مجالس میں شریک ہو سکتا ہے تو وہ سکریٹری کے عہدہ کو خوشی سے قبول کرنے پر آمادہ ہیں۔

ہز آنر نے اس تقریر کے جواب میں فرمایا کہ "گورنمنٹ کو اُن پر اعتماد ہے اور وہ کسی کی آزادی کو نہیں روکتی۔"

جب یہ اصولی سوال طے ہو گیا تو اُنہوں نے سکریٹری شپ منظور کر لی اور ہز آنر نے اسٹریچی ہال میں آکر ایڈریس لیا اور جواب میں کالج کی ترقی پر مبارکباد دی۔ نواب محسن الملک کے انتخاب ثانی پر اظہار مسرت کر کے فوائد کالج کے لئے اس کو بہتر سے

---

[1] ملاحظہ ہو تقرر مارچ سنہ ۱۹۰۲ء

بہتر انتخاب قرار دیا۔

اگرچہ اس پیچیدگی ومشکل کے سلجھانے اور رفع کرنے میں زیادہ وقت صرف ہوا لیکن ان کی سرگرمیوں میں کوئی رکاوٹ نہ تھی اور وہ برابر اور مسلسل انہاک کے ساتھ کام کرتے رہے۔

عربی اسکیم اور جدید پیچیدگی

سر انٹونی میکڈانل کی پیدا کی ہوئی پیچیدگی دور ہوتے ہی ایک نیا پیچیدہ سوال سامنے آیا۔ ۱۹۰۲ء میں لارڈ کرزن نے جو تعلیمی کمیشن قائم کیا تھا اس سے عام طور پر یہ خیال تھا کہ گورنمنٹ جدید تعلیم کی ترقی کو خطرناک سمجھ کر روکنا چاہتی ہے۔ اسی کمیشن کے سلسلہ میں مسٹر ماریسن امپیریل کونسل میں عارضی ممبر بھی نامزد ہوئے تھے جو ایم، اے، او کالج کے لئے بڑی عزت تصور کی گئی تھی۔ کالج کے پروفیسر مسٹر گاڈ فری براؤن نے عربی تعلیم کی ایک اسکیم کانفرنس منعقدہ بمبئی کے اجلاس میں پیش کی کہ ایک لائق اسٹاف رکھا جائے تاکہ ایم اے کے طلبا ر کو جو عربی میں ڈگری لیں اور بی اے میں جو زبانِ ثانوی کے طور پر لیں تعلیم دے۔ اسٹاف میں ایک انگریز پروفیسر ہو جو عربی کا عالم ہو اور یورپ میں عربی تعلیم اور تحقیقات علمی کے متعلق جو کچھ ہو رہا ہے اس سے باخبر ہو اور یہ تعلیم موجودہ سائنٹیفک طریقہ سے دے، نیز ایک مصری عالم بھی مقرر کیا جائے۔ گورنمنٹ آف انڈیا نے بھی امپیریل بجٹ سے لوکل گورنمنٹوں کو تعلیمی امداد کے لئے ایک عطیہ دیا اور اس عطیہ سے صوبہ متحدہ کی گورنمنٹ نے ایم، سی کالج الٰہ آباد میں سائنس کی تعلیم کے لئے ہندو کالج میں سنسکرت کی اور ایم، اے، او، کالج میں عربی تعلیم کے لئے امداد دینی تجویز کی۔

اس سلسلہ میں یہ تجویز سامنے آئی کہ علی گڑھ میں علوم عربیہ کی تکمیل اور تحقیقات کی غرض سے ایک دارالعلوم کھولا جائے۔ ہندوستانی اور مصری پروفیسر مامور کئے جائیں فیلوشپ مقرر ہوں۔ نایاب اور غیر مطبوعہ کتابیں فراہم کی جائیں اور اُن کو شائع کیا جائے اور سائنٹیفک طریقہ پر باقاعدہ تعلیم ہو اور اس کا مقصد علم کا علم کے لئے حاصل کرنا ہو

اوّل الذکر کے اخراجات پندرہ سو روپیہ ماہانہ اور ثانی الذکر کے اخراجات تین ہزار ماہانہ تھے علاوہ بریں معقول تعداد کے وظائف کا بھی انتظام تھا۔

نواب صاحب نفسِ تعلیم کے مخالف نہ تھے لیکن ان کے نزدیک کالج میں یہ تحریک اور سکیم مصلحت وقت اور اقتضائے حالات کے خلاف تھی وہ خیال کرتے تھے کہ :۔

"اس وقت مسلمانوں کی جو توجہ انگریزی تعلیم اور اس کے سامان کی تکمیل کی طرف ہو چلی ہے وہ پھر جائے گی یا منقسم ہو جائے گی اور ایسی حالت میں جب کہ اس وقت کالج کے پاس اتنا سرمایہ بھی نہیں ہے کہ اُس کی آمدنی سے ایک صیغہ کا خرچ بھی چل سکے، قانونی تعلیم کے لئے کوئی پروفیسر نہیں ہے عمارتیں غیر مکمل ہیں اور ضروری عمارتوں کے نقشے تک مرتب نہیں ہو سکے ہیں طلبا کو دماغی تعلیم میں ترقی کرنے کے لئے کوئی اچھا کتب خانہ تک نہیں تو کیوں کر ممکن ہے کہ عربی تعلیم کے لئے ایسا سرمایہ جمع کرنے کی کوشش بار ور ہو سکے جو اب تک انگریزی تعلیم کے لئے بھی نہ ہو سکی"

اس لئے انھوں نے سخت اختلاف کیا اور مسلمان ماہرین تعلیم کی رائیں حاصل کر کے ان کو بھی شائع کیا اس سلسلہ میں جو مضامین[۵] انھوں نے لکھے تھے وہ نہایت پُرزور مدلّل اور اہم تھے البتہ وہ اس بات پر آمادہ تھے کہ اگر کسی قسم کی قید و شرط نہ لگائی جائے اور ایم اے کی تعلیم صرف عربی پر محدود نہ کی جائے بلکہ دوسرے مضامین کے لئے بھی اس کا دروازہ کھلا رہے اور عربی ایک اختیاری مضمون ہو تو جدید اصول تعلیم رائج کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ چنانچہ اس غرض کے لئے انھوں نے ایک ہندوستانی اور ایک مصری عالم کے تقرر کی تجویز بھی منظور کی تھی۔

یہ مسئلہ انتہائی پیچیدہ تھا گورنمنٹ کے رجحان کے باعث ٹرسٹی آزاد ی گیا تھا

---

[۵] یہ تمام مضامین اخباری اور کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔

رائے ظاہر کرنے سے مجبور تھے۔ ہز ہائینس آغا خاں بھی سرکاری اسکیم کے اتنے موید تھے کہ اس کی نامنظوری کی صورت میں ان کی امداد بند ہونے کا احتمال تھا لیکن نواب محسن الملک اس پر کسی طرح آمادہ اور راضی نہ ہوئے وہ اس تجویز کو انگریزی تعلیم اور کالج کی ترقی کے لئے سخت خطرہ[1] سمجھتے تھے اور اس میں شک نہیں کہ اس اسکیم پر عمل کرنے سے اس وقت مسلمانوں کو نقصان عظیم پہونچ جاتا۔

مگر بالآخر ہز آنر سر جیمس لاٹوش نے اس تردد کو رفع کیا وہ کالج میں تشریف لائے ٹرسیٹوں سے پرائیوٹ ملاقات کر کے غلط فہمیوں کو دور کیا اور تبادلہ خیالات کے بعد یہ طے ہوا کہ گریجویٹوں کی تعلیم کے لئے عربی کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ گورنمنٹ ایک یوروپین پروفیسر کے اخراجات ادا کرے اور مسلمان ایسے طلبا ر کے لئے مخصوص وظائف کا انتظام کریں۔

اس قرار داد کے مطابق کالج میں ایک یوروپین مستشرق اور ایک مصری عالم کا تقرر ہوا امرا اور اصحاب خیر نے وظائف کی معقول تعداد مقرر کی اور سرمایہ دیا۔

اس تجویز کے سر آغا خاں بھی بڑے موید تھے اور ان کو اس درجہ اصرار تھا کہ نامنظوری کی صورت میں اپنی امداد بند کر دینے کا بھی اشارہ کر دیا تھا لیکن نواب محسن الملک نے بھی زبردست اختلاف کیا اور آخر کار کامیاب ہوئے۔ انھوں نے ہز ہائینس کی تشریف آوری فروری ۱۹۰۵ء کے موقع پر ہز ہائینس کے سامنے بھی اسٹریچی ہال میں کہا تھا کہ :-

"بے شک ہم لوگوں نے ابتدا میں تعلیم عربی کی سکیم کی مخالفت کی تھی یہاں تک کہ خود جناب ممدوح کو ناراض کر دیا تھا۔ مگر اس کا اصل سبب کالج کی خیر خواہی کا خیال تھا اور ہمارا فرض تھا کہ جب کوئی ایسا معاملہ آن پڑے جس پر ہماری قوم

---

[1] بنارس میں بھی یہی تردد تھا کہ حکومت تعلیم انگریزی کی جگہ سنسکرت کی تعلیم جاری کرنا چاہتی ہے چنانچہ ہز آنر لفٹننٹ گورنر نے ۱۹۰۵ء میں وہاں ایک تقریر میں اس تردد کو دور کیا اور سمجھایا کہ یہ تبدیلی نہیں بلکہ اضافہ ہے۔

کے بچوں کی نسبت کا فیصلہ ہو تو ہم کسی بات کی جو ہماری دانست میں مضر ہو
حتی المقدور سخت مخالفت کریں اور ضرر اور نقصان کے اندیشہ سے اپنے کالج
اور اپنی قوم کو محفوظ رکھیں خواہ اس مخالفت میں وہ لوگ بھی ناراض ہو جائیں جو
ہم کو مدد دیتے ہیں اور اپنا عطیہ بھی بند کر دیں مگر جب ہمیں یقین ہو گیا کہ تعلیم عربی
کی تجویز ترمیم ہو کر ایسی ہو گئی ہے کہ جس سے ہماری قوم کے بچوں کو کوئی نقصان
نہیں پہونچ سکتا اور جو علمی ترقی کی مؤید ہے نہ کہ ہماری دینوی اور تعلیمی ترقی
کے مانع ۔ تو ہم نے نہایت شوق اور جوش کے ساتھ اس اسکیم کی تائید کی، اس کو
منظور کیا اور اس کو اختیار کیا اور اس کے لئے روپیہ جمع کرنا شروع کر دیا ہم
مسلمان ہیں اور مسلمانوں کے خیر خواہ ہم سے زیادہ کون علوم عربی کی قدر کرنیوالا
اور علوم عربی سے محبت کرنے والا ہو سکتا ہے"

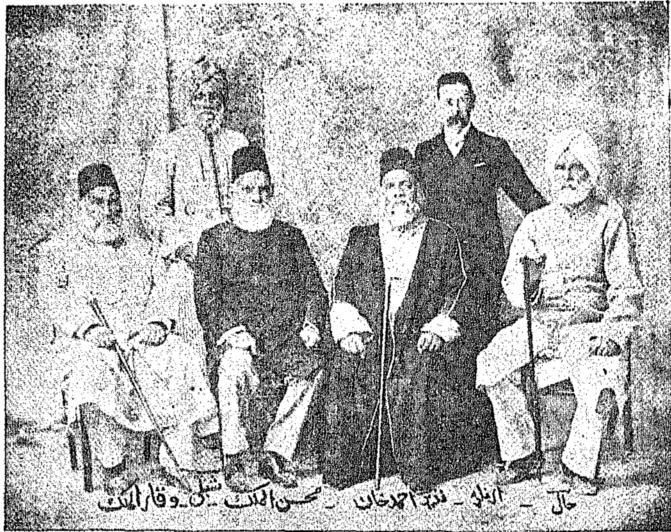
تعلیم سائنس کی تجویز

عربی اسکیم کے سلسلہ میں ہمدردانِ قوم کا خیال سائنس کی تعلیم پر منعطف ہو گیا نواب محسن الملک نے موقع سے فائدہ
اٹھا کر اس کی ضرورت اور اس کے انتظام پر توجہ دلائی اور باقاعدہ سلسلہ کوشش شروع
کر دیا۔ ہز ہائینس سر آغا خاں نے بھی دلی تائید کی۔ اور جب کالج میں ہز رائل ہائینس پرنس
آف ویلز کی تشریف آوری طے ہو گئی تو جناب موصوف نے جنوری ۱۹۰۵ء میں اس
شاہی خیر مقدم کی مستقل یادگار کے طور پر پرنس آف ویلز سائنس اسکول قائم کیے جانے کی
تحریک کی اور پینتیس ہزار روپیہ کا چک بھی بھیجدیا۔

کانفرنس بطور محور عمل

اِن ہی حالات میں جن کا ایک سرسری خاکہ اوراقِ ما سبق میں ہے نواب محسن الملک نے کالج کی ترقی اور
قوم میں تعلیمی تبلیغ کے لئے اپنی کوششوں کا سلسلہ جاری رکھا۔ انہوں نے ابتدا سے
کانفرنس کو اپنا محور عمل قرار دیا اور اس کو حقیقی تعریف میں آل انڈیا انسٹی ٹیوشن بنا کر

به موقع اجلاس کانفرنس منعقده بمبئی





تمام قوم کو اس کے پلیٹ فارم پر جمع کر لیا تقسیم عمل کے اصول پر ۱۹۰۱ء میں اصلاح تمدن اور مدارس کے اور ۱۹۰۳ء میں ترقی اُردو کے شعبے قائم کئے اور ہر شعبہ ایک سکریٹری کے متعلق رکھا ۱۸۸۶ء تا ۱۸۹۷ء اس کے گیارہ اجلاس صرف صوبہ متحدہ اور پنجاب میں منعقد ہوئے تھے لیکن ۱۸۹۸ء سے ۱۹۰۶ء تک نو اجلاس رام پور، علی گڑھ، لاہور و دہلی، لکھنؤ، کلکتہ، ڈھاکہ، مدراس اور بمبئی میں منعقد ہوئے، گورنروں اور اعلیٰ حکام نے بھی اپنی شرکت سے اجلاسوں کو رونق بخشی۔ دہلی کا اجلاس (۱۹۰۲ء) اپنی عظمت و شان کے لحاظ سے اور لکھنؤ (۱۹۰۶ء) کامالی کامیابیوں کے لحاظ سے یادگار رہے ہر اجلاس میں ممبروں اور وزیٹروں کی حاضر تعداد ہزاروں سے متجاوز ہوتی تھی اور وہ ایک خاص اثر لے کر جاتے تھے۔ وظائف اور کالج کے لئے ہزاروں، لاکھوں روپیہ وصول ہوتا تھا اور تمام مسائل تعلیم پر نہایت قیمتی آرا حاصل ہو جاتی تھیں۔

ڈائرکٹر جنرل ایجوکیشن کی رائے | ان اجلاسوں کے اثرات کو ڈائرکٹر جنرل تعلیمات ہند نے اپنی پنج سالہ رپورٹ ۱۹۰۷ء میں یوں بیان کیا ہے کہ:۔

"اس زمانہ میں مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے جو اسباب تھے ان میں ایک بلند مقام اس جدوجہد کو دینا چاہیئے جو مرحوم نواب محسن الملک ایسے پر جوش لیڈروں اور ان کے قائم کردہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ جلسوں کے ذریعہ جاری رہی یہ تمام کوششیں بے اثر نہیں رہیں، ہندوستان کے دور دراز اور بعید مقامات کے مسلمان اپنے ہم مذہب بھائیوں کی تعلیم کے متعلق اپنا فرض بہتر سمجھنے کے لئے بیدار ہو گئے اور تعصب کے دور کرنے اور تعلیم و ترقی کی خواہش مستقل کرنے سے بیش بہا کام پورا ہو رہا ہے۔"

انسٹی ٹیوٹ گزٹ کا اجرا | نواب محسن الملک اخبار کی قوت سے واقف تھے۔

اِس لئے آغاز کار ہی میں اُنہوں نے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کو جو عرصہ سے بند تھا پھر جاری کیا اس کو حالاتِ کالج کی اشاعت کا ذریعہ تبلیغ تعلیم کا وسیلہ اور قومی پالیسی کا منّاد بنایا۔

قومی اخبارات سے امداد ساتھ ہی تمام قومی اخبارات کو متوجہ کیا اور ان کے ذریعہ سے پبلک نے کالج کانفرنس اور قومی تعلیم و مقاصد کے مباحث میں دلچسپی لینی شروع کی اور اس طرح قوم میں عام رجحان پیدا کر دیا۔

علما کا اشتراک عمل جب سے کالج قائم ہوا علما و مشائخ نے محض مذہبی نقطۂ خیال سے اس کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا مگر نواب محسن الملک نے ان کے تعصب و نفرت کے دور کرنے پر بھی توجہ کی وہ علما جو کالج کی طرف رخ کرنا بھی گناہ سمجھتے تھے اکثر کانفرنس کے اجلاسوں اور کالج میں تشریف لاکر اپنے مواعظ سے مستفید کرنے لگے۔

مولانا عبد الباری کا اعتراف مولانا عبد الباری صاحب مرحوم فرنگی محلی نے ایک خط موسومہ مؤلف میں لکھا تھا کہ یہ امر ظاہر ہے کہ سر سید کے ساتھ ہم لوگ نہ تو معاندانہ پیش آئے نہ مویدانہ پیش آئے۔ ان کی مذہبی فروگزاشت سے زیادہ ہمارے اکابر کو ان کی سیاست سے بیگانگی تھی، ان کے استقلال طبع کے باعث جو خود رائی تھی اس کا تدارک ناممکن تھا اس وجہ سے اکثر مواقع پر تنفر ہو جاتا تھا اس کے اندفاع میں نواب سید مہدی علی خاں ایسے صلح جو اور متاثر مزاج شخص کی ضرورت تھی اور خدا کی حکمت نے ان کو انتخاب کیا تھا۔

سفر اور دورے نواب محسن الملک نے اس ضعف و ناتوانی میں جو عمر و صحت کی وجہ سے تھی موسموں کی سختی برداشت کرکے ہر سال متعدد سفر اور دورے کئے کلکتہ، ڈھاکہ، مدراس، پونا، جوناگڑھ، بھوپال وغیرہ تک گئے ہر طبقہ اور ہر درجہ کے آدمیوں سے ملے۔ والیان ملک اور ان کے وزیروں اور عہدہ داروں سے ملاقاتیں

کیں۔ صوبوں کے اعلیٰ حکام سے ربط و ضبط کیا اور ان کو ہمدرد بنا لیا۔

رنگون کے سفر کی حالت سنہ ۱۹۰۴ء میں جب رنگون گئے ہیں تو اُن کی عمر ارسٹھ سال کی تھی، کچھ مدّت پہلے بیماری کا جھٹکا اُٹھا چکے تھے اور پوری صحت بھی نہ ہوئی تھی مصروفیتیں بھی کچھ کم نہ تھیں۔ مگر اسی حالت میں سفر کیا اور تقریبًا مہینہ بھر مقیم رہے۔

غرض ان سفروں اور دوروں میں اپنی اعجاز بیانی اور اخلاق سے بڑے بڑے امرا، تجار اور والیان ملک اور طبقاتِ عوام و خواص پر اثر ڈالا قومی تعلیم اور قومی یونیورسٹی کا خیال دلوں میں جاگزین کیا اور قومی تحریکات کا دلدادہ بنایا۔

انجمن الفرض کے وفود انجمن الفرض ابھی تک محدود پیمانہ پر تھی نواب صاحب نے اس کو وسیع کیا قابل نوجوانوں کے وفود مرتب کرائے ان کے سامنے تقریریں کر کے جذبات پیدا کئے اور عرض و طول ہند میں روانہ کئے تاکہ غریب طلبار کے لئے وظائف کے چندے جمع کریں مسلمانوں کو کالج اور مقاصد قومی پر توجہ دلائیں۔

کالج ڈپوٹیشن کی روانگی ایران سنہ ۱۹۰۳ء میں مولوی سید حسن عسکری نے جو کالج میں کچھ مدّت ملازم رہ چکے تھے شیراز سے مسٹر ماریسن کو ایک خط لکھا جس میں ان کو زمانہ تعطیل وہاں گزارنے کی دعوت دی اور یہ بھی لکھا کہ:۔

> "بعض ایرانی اپنے بچوں کو تعلیم جدید دینا چاہتے ہیں لیکن یہاں انتظام نہیں ہے اگر کالج کا کوئی ڈپوٹیشن آئے تو غالبًا کچھ طلبار علی گڑھ جانے کے لئے آمادہ ہو جائیں گے"

مسٹر ماریسن نے نواب محسن الملک سے تذکرہ کیا، اُنھوں نے مقامی ٹرسٹیوں سے رائے لی تو یہ طے پایا کہ چوں کہ حفاظت جان کی کوئی ضمانت نہیں ہو سکتی اس لئے

ڈپوٹیشن کا بھیجنا مناسب نہیں۔

مارسین صاحب شملہ جا چکے تھے ان کو اطلاع دی گئی لیکن انہوں نے حکومت سے حفاظتی انتظامات کے متعلق تمام امور طے کرکے اپنی رائے پر اصرار کیا اور بالآخر ٹرسٹیوں نے بھی منظوری دے دی۔

ممبران اسٹاف سے خاں صاحب میر ولایت حسین بی اے اور سید جلال الدین ایم اے۔ طلبا میں سے سید ابو محمد صاحب ایم اے اور جمیل احمد صاحب منتخب کئے گئے کالج کے متعلق بعض معلومات و حالات کا فارسی میں ترجمہ ہوا اور یہ ڈپوٹیشن بوشہر ٹھہرتا ہوا شیراز گیا۔ دونوں جگہ عمائدین و ارکان حکومت سے ملاقاتیں کیں۔ کالج کے حالات بیان کئے اور حکومت کی اجازت سے ان مطبوعہ کیفیتوں کو مشتہر کیا۔

وہاں جاکر معلوم ہوا کہ بلاشبہ ایرانیوں میں تعلیم جدید کا شوق پیدا ہوگیا ہے اور متعدد ایرانی نوجوان ممالک یورپ میں تعلیم کے لئے جا چکے ہیں۔

اگرچہ مولوی سید حسن عسکری کا خط اور ڈپوٹیشن کی روانگی خالص تعلیمی نقطۂ نظر سے کچھ بھی قابل اعتراض نہ تھی بلکہ ہندوستانی اور ایرانی مسلمانوں کے تعلقات و روابط اور کالج کی شہرت اور عالمگیر اثر قائم کرنے کے لئے ایک بہترین موقع تھا لیکن چونکہ اس زمانہ میں شمالی ایران میں روس کا اور جنوبی ایران میں انگریزوں کا اثر و رسوخ بڑھ رہا تھا اور دونوں سلطنتوں کی کوشش تھی کہ ایک دوسرے پر سبقت لے جائے اس لئے عام خیال یہی تھا کہ ڈپوٹیشن کی روانگی پر مارسین صاحب نے سیاسی اغراض کو پیش نظر رکھکر زور دیا تھا بہرحال ایرانیوں میں تعلیم جدید کی خواہش تھی۔ ہندوستان کے مصارف بھی کم تھے ڈپوٹیشن کو کامیابی ہوئی اور بارہ طلبا آکر کالج میں داخل ہوئے۔

کالج میں فوجی ٹریننگ کا خیال

نواب محسن الملک باعتبار ملازمت خالص سول لین تھے اہلکاری سے حیدرآباد کی افسرانہ منازل

تک قلم ہی ان کے ہاتھ میں رہا لیکن ان کی تقریروں اور بعض تحریروں میں سپاہیانہ جوش اور عسکری ولولہ ہمیشہ پایا گیا۔ روسی پیشقدمی پر ۱۸۸۵ء میں جو مضمون لکھا تھا اس میں اس جوش اور ولولہ کی پوری جھلک موجود ہے اور یہ چیز ان کی نسلی وراثت تھی سادات بارہ کی تاریخ اسی جوش و جذبہ سے معمور ہے کالج میں رائڈنگ اسکول کا قیام بھی اسی کا اثر تھا مگر وہ اس سے آگے بڑھ کر طلبائے کالج کا ایک کیڈٹ کور بنانا چاہتے تھے۔

۱۹۰۵ء میں سر الفریڈ گیسلی کمانڈر افواج احاطہ بنگال کی کالج وزٹ کے موقع پر جو ایڈرس پیش کیا گیا تھا تو اس میں اس ارادہ کو یوں ظاہر کیا تھا کہ "کالج کو امید ہے کہ آیندہ گورنمنٹ سے اجازت مل جائے گی کہ طلبائے کالج کا ایک کیڈٹ کور قائم کیا جائے جو فوجی اعتبار سے ایک خفیف چیز ہوگا لیکن یقین ہے کہ کسی اندرونی بدانتظامی کے وقت ہمیشہ گورنمنٹ کے کام آئیگا۔ کالج کے انتظام اور گورنمنٹ کے اطمینان کے لئے ہماری چھوٹی سی فوج کے افسر کالج اسٹاف کے انگریز ہوں گے"۔

پھر اپنی تقریر میں اس خیال پر زور دیا کہ "مسلمانوں میں ہمیشہ وہ دو خوبیاں رہی ہیں جن کا بہت کم کسی قوم میں اجتماع ہوا ہے یعنی ہماری قوم صاحب سیف و قلم رہی ہے اور اب ہمیں گوارا نہیں کہ وہ خوبیاں ہاتھ سے جاتی رہیں۔ ہم سیف و قلم دونوں کو اپنے ہاتھ میں رکھیں گے مگر قلم ہمارا ہماری قوم کی خدمت میں استعمال ہوگا اور تلوار ہماری گورنمنٹ کے کام آئے گی گورنمنٹ کے حکم سے اور گورنمنٹ کے لئے میان سے باہر نکلے گی اور گورنمنٹ کے حکم سے پھر میان میں چھپ جائے گی"۔

پھر نومبر ۱۹۰۶ء میں لارڈ کچنر سپہ سالار افواج ہند کی وزٹ کے موقع پر بھی ایڈرس میں اسی خیال کو بیان کیا تھا۔ اوّل موقع پر اخبارات نے بھی اس مسئلہ پر خوب بحث کی تھی اور انگریزی اخبارات نے کسی قدر تردد کے ساتھ اس خیال کو قابل تسلیم قرار دیا تھا لیکن نواب محسن الملک کی موت نے اس خیال وارادہ کو پورا نہ ہونے دیا۔

اب کہ جنگ عظیم کے بعد یونیورسٹیوں میں فوجی ٹریننگ کی طرف توجہ ہوئی اور ہر یونیورسٹی میں اس کا انتظام کیا گیا ہمارے نزدیک تو اسی خیال و ارادہ کا نتیجہ ہے جو ۱۹۰۵ء میں اسٹریچی ہال میں ظاہر ہوا تھا۔

کالج کی وقعت و عظمت

ایم، اے، او، کالج میں سر ولیم میور اور لارڈ لٹن کے زمانہ سے سلطنت ہند کے اعلیٰ حکام اور والیان ملک کی تشریف آوری بطور ایک رسم و روایت کے رہی لیکن نواب محسن الملک کی موقع شناسی اور ادکار و مساعی سے اس رسم و روایت میں وہ اضافہ ہوا جو ہمیشہ اس ادارہ کی تاریخ کا سرمایہ نازش و افتخار رہے گا۔

عاقبت مقبولی کالج بدیں غایت رسید
تربیت گاہ غریباں شد گذرگاہ شہاں

(۱)

دی رائل ہائینس پرنس و پرنسز آف ویلز کا ورود مسعود

دی رائل ہائینس جب ہندوستان رونق افروز ہوئے تو شاہی پروگرام میں علیگڑھ نہ تھا اور گورنمنٹ نے ٹرسٹیان کالج کی درخواست نامنظور کر دی تھی۔ مگر نواب محسن الملک نے کرنل ڈنلاپ اسمتھ، لارڈ منٹو کی تائید و مہربانی اور ہز ہائینس سر آغا خاں کے ذاتی اثر سے فائدہ اٹھایا۔ اور ۷ اکتوبر ۱۹۰۵ء کو حکومت نے منظوری کی اطلاع دی۔ ۸ مارچ ۱۹۰۶ء کو دی رائل ہائینسز ایم، اے، او، کالج میں پرائیویٹ طریقہ سے بطور مہمان جلوہ افروز ہوئے۔

خیر مقدم | کالج کی زیبائش و آرائش کا اہتمام اور خیر مقدم کا انتظام مہمان محتشم

دعز یزکی عظمت و مرتبت کے لحاظ سے تھا۔ اکثر ٹرسٹی اولڈ بوائے اور دیگر معزز اصحاب تاریخ معینہ سے کئی دن پہلے آگئے تھے ہز ہائینس آغاخاں وزیٹر کالج اور ہز آنر سر جیمس لاٹوش پیٹرن کالج بھی تشریف فرما تھے۔

ایک بجے شاہی اسپیشل اسٹیشن پر پہنچا جہاں کلکٹر علی گڑھ وکمشنر میرٹھ نے استقبال کیا دس منٹ میں شاہی سواری کالج کے احاطہ میں داخل ہوگئی۔ وکٹوریہ گیٹ پر تمام عہدہ داران کالج نے خیر مقدم کیا ہز آنر نے نواب ممتاز الدولہ سر فیاض علی خاں پریسیڈنٹ اور نواب محسن الملک آنریری سکریٹری کو حضور شاہی میں پیش کیا جن سے ہز رائل ہائینس نے ہاتھ ملایا اور پھر ان دونوں نے کالج کے ٹرسٹیوں کو اور کمشنر نے ممبرانِ اسٹاف کو باریاب کرایا اور سب کو شاہی مصافحہ کا شرف عطا ہوا۔

اِس کے بعد ہز رائل ہائینس مسقّف راستہ اور طلبائے کالج و اسکول کی دو رویہ صفوں سے نعرہ ہائے مسرت میں اسٹریچی ہال کے قریب پہونچے جہاں قدیم طلبا آداب شاہی بجالانے کے لئے صف بستہ حاضر تھے۔

لنچ

یہاں سے لٹن لائبریری میں رونق افروز ہوکر لنچ تناول فرمایا۔ اس قومی دعوت میں بہتّر ٹرسٹیز اسٹاف اور دیگر مہمان بھی شریک تھے۔

سائینس اسکول کا قیام اور ہز رائل ہائینس کی منظوری و مسرت

لنچ سے فارغ ہونے کے بعد ہز ہائینس آغاخاں نے سائنس اسکول کی بابت تذکرہ کیا جو حضور ممدوح کی یادگار میں قائم ہونا قرار پایا تھا اور بمبئی کے مشہور فیاض تاجر آدم جی پیر بھائی کا تار ملاحظہ میں پیش کیا جو اسی وقت نواب محسن الملک کے نام موصول ہوا تھا اور جس میں اِس سائینس اسکول کے لئے ایک لاکھ دس ہزار کے عطیہ کی اطلاع تھی، ہز رائل نے تار ملاحظہ فرماکر اسکول کے قائم ہونے پر اظہار مسرّت فرمایا۔

کالج کا معائنہ کچھ دیر بعد ہز رائل ہائینس نے کالج کا بالتفصیل معائنہ شروع کیا، ہز آنر سر جیمس لاٹوش ہز ہائینس آغا خان، نواب محسن الملک (نواب بہادر ڈاکٹر سر) محمد مزمل اللہ خان جائنٹ سکریٹری مسٹر آرچ بولڈ پرنسپل معیت میں تھے اسٹریچی ہال اور کالج کلاسیز کا معائنہ فرما کر پختہ بارگ[۱] کے چھ کمروں کو اندر سے ملاحظہ فرمایا اور بورڈروں سے یہ الطاف خسروانہ باتیں کیں۔

پختہ بارگ کے دروازہ سے گاڑی میں سوار ہو کر انگلش وارڈ تشریف لے گئے جو سرسید کی کوٹھی میں تھا گاڑی سے اتر کر اُس کتبہ[۲] کو ملاحظہ کیا جو اُس کے پورٹکو میں لارڈ کرزن کے عطیہ سے نصب ہے یہاں سید راس مسعود (نواب سر ڈاکٹر) حضور شاہی میں پیش کئے گئے ہز رائل ہائینس نے ان سے مصافحہ کیا اور ان کی تعلیم کے متعلق حالات دریافت کر کے اظہار مسرت کیا۔ کلاسوں میں بھی تعلیم کے متعلق کچھ سوالات فرمائے۔

مسجد کا ملاحظہ اور خدائے ذوالجلال کے نام کا احترام اس کے بعد ممتاز لاٹوش بورڈنگ ہاؤس کی سڑک سے کالج کے مغربی دروازہ میں داخل ہوئے گاڑی سے اتر کر مسجد کو ملاحظہ کرتے ہوئے سرسید اور سید محمود کے مزاروں پر گئے یہاں سے واپسی میں دروازہ تک تشریف لائے تھے کہ موذن نے نماز عصر کی اذان دی۔

اللہ اکبر کا پُرجلال نام سُنتے ہی ہز رائل ہائینس نے تعظیم کے لئے ٹوپی اُتارلی اور تاختم اذان اسی طرح مؤدب کھڑے رہے۔

---

[۱] نمبر ۳ و ۴ و ۶ و ۱۱ و ۱۳ و ۳۵ کا ملاحظہ کیا جن میں عباس مرزا، علی رضا، سید محمود (ڈاکٹر جنرل سکریٹری کانگرس)، آفتاب عمر، تصدق احمد خاں (شروانی) محمد اکرم (خواجہ انسپکٹر جنرل پولیس) ابن احمد صاحبان بورڈر تھے۔

[۲] اس کتبہ پر سرسید کی تاریخ ولادت و رحلت وغیرہ بطور یادگار تحریر ہے۔

مراجعت

پھر نظام میوزیم میں کچھ دیر استراحت فرما کر بقصد مراجعت روانہ ہوئے دورویہ صفوں سے نعرہ مسرت بلند ہوا دروازہ پر ہار پہنائے گئے اور کالج کی تصاویر کا خوبصورت مرقع جو ہاتھی دانت کے نفیس بکس میں رکھا ہوا تھا قبول فرما کر خدا حافظ کی مخلصانہ و مودبانہ گونجتی صداؤں میں مراجعت کی۔

ہز رائل ہائینس کی تقریر میں علی گڑھ کا تذکرہ

مراجعتِ ہند کے بعد جب گلڈ ہال لندن میں ہز رائل ہائینس نے اپنی سیاحت پر تقریر فرمائی تو ایم، اے، او، کالج کو فراموش نہیں کیا اور اس کی نسبت فرمایا کہ:۔

"مختلف حصصِ ہند میں متعدد کالج اور دیگر تعلیمی اداروں کا مشاہدہ کرنے کے بعد مجھے اس امر کا اندازہ کرنے میں تھوڑی بہت واقفیت ہوئی ہے کہ کس طور پر جمہور انام کو لبرل ایجوکیشن سے عام طور پر مستفید کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے مثال کے طور پر میں علی گڑھ کے مہتمم بالشان کالج اور اسکول کا تذکرہ کروں گا جسکی اعانت، انتظام و انصرام مختلف اکناف ہند کے مسلمان کرتے ہیں طلبا کے بود و ماند کا جو طریقہ اکسفورڈ اور کیمبرج میں رائج ہے اسی کو مناسب حال بنا کر یہاں بھی نافذ کیا گیا ہے، اس کے ساتھ ساتھ ورزشی مشاغل کی طرف سے بھی غفلت نہیں برتی گئی ہے اور تمام اسکول اور کالجوں میں کرکٹ اور فٹ بال میں ترقی کرنے کا جذبہ کارفرما ہے۔

اِس میں کوئی شک نہیں کہ اِس قسم کے ادارے آیندہ نسل کی سیرت کی تشکیل و تعمیر میں بڑی حد تک مُعین ہوں گے"۔

(۲)

ہز مجسٹی امیر افغانستان کا نزولِ اجلال

۱۹۰۶ء میں جب کہ ہز مجسٹی امیر حبیب اللہ خاں کی سیاحت ہند تیقن ہوگئی تو نواب محسن الملک نے علی گڑھ کو بھی پروگرام میں داخل کئے جانے کی کوشش کی، ہز اکسیلینسی لارڈ منٹو اور کرنل سمعیل خاں سفیر افغانستان کی توجہ سے کامیاب ہوئے اور ۱۶ جنوری ۱۹۰۷ء کی تاریخ محمڈن کالج میں تشریف آوری اور اس کا معائنہ شاہی پروگرام میں معین کی گئی۔

تاریخ معینہ سے کئی دن پہلے مختلف صوبجات ہند سے ہر درجہ اور طبقہ کے مسلمان ایک خود مختار ہم قوم بادشاہ کے دیدار کی مسرّت حاصل کرنے کے لئے اس قومی مرکز میں جمع ہوگئے تھے، کالج کی طرف سے مہمانوں کے قیام و آسائش کا بھی نہایت وسیع پیمانہ پر اہتمام تھا اسٹیشن سے کالج تک اور کالج کے اندر کی آرائش و زیبائش میں پورا جوش اور کامل سلیقہ جلوہ گر تھا۔

اسٹیشن پر استقبال کمشنر میرٹھ کلکٹر ضلع، نواب ممتاز الدولہ سر فیاض علی خاں پریسیڈنٹ، نواب محسن الملک (نواب بہادر ڈاکٹر سر) محمد مزمل اللہ خاں اور چند ٹرسٹی صاحبان استقبال کے لئے اسٹیشن پر حاضر تھے ٹھیک دس بجے ہز مجسٹی کا اسپیشل اسٹیشن میں داخل ہوا اعلیٰ حضرت کے شاہی سیلون سے برآمد ہونے پر حاضرین اپنے اپنے طریقہ پر آداب بجالائے۔ پھر پلیٹ فارم پر رسمی تعارف کے بعد ہز مجسٹی کالج کے رائڈنگ اسکول اسکوٹ، آٹھویں لینسرز اور افغان سواروں کے جلو میں کالج کی جانب روانہ ہوئے سڑک کے دونوں جانب خلقت کا ہجوم تھا جس نے نہایت جوش و خروش کے ساتھ خوش آمدید کہا اور ہندوؤں نے "امیر کی جے" کے نعرے لگائے، کالج کے صدر دروازہ پر نواب محسن الملک نے جو دوسرے راستہ سے

آچکے تھے ٹرسٹیوں، یورپین اور ہندوستانی اسٹاف کے ممبروں کا نام بنام تعارف کرایا۔

نواب محسن الملک کی آزمائش یا مکالمہ

اس کا سلسلہ ابھی ختم نہ ہوا تھا کہ ہز مجسٹی کا وہ مکالمہ شروع ہوا جس نے نواب محسن الملک کو ایک شدید آزمائش میں مبتلا کر دیا اور معلوم ہوا کہ شاہِ افغانستان محض تفریح و تماشہ کے لئے علی گڑھ تشریف نہ لائے تھے بلکہ یہاں کی لامذہبی کی سُنی ہوئی روایات کی تفتیش وتحقیق مدعائے اصلی تھا۔ چنانچہ انٹروڈکشن کے دَوران میں اعلیٰ حضرت نے فرمایا۔

"میں نے اِس کالج کے متعلق بہت سی باتیں سُنی ہیں، بعض اس کے موافق ہیں اور بعض مخالف، لیکن مخالف باتیں زیادہ سُنی ہیں، حضرت علی کا قول ہے کہ سچ اور جھوٹ میں چار اُنگل کا فاصلہ ہے جو آنکھ اور کان کے درمیان ہے کان سے میں نے سُن لیا اب آنکھ سے دیکھنے آیا ہوں"

نواب محسن الملک نے کالج کی چند خوبیاں بیان کرنی چاہیں تو اعلیٰ حضرت نے فرمایا:۔

"مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید، مجھ سے کالج کی بہت سی برائیاں کی گئی ہیں"

نواب محسن الملک۔ قیلَ اِنَّ الالٰہ ذُو وَلَدٍ[1] قیل اِنَّ الرَّسُولَ قَدْ کَھَنَا
مَا نَجَی اللّٰہُ وَالرَّسُوْلُ مَعًا مِنْ لِسَانِ الوَرٰی فَکَیفَ اَنَا

ہز مجسٹی۔ سچ ہے، لیکن جب تک ہر چیز کا معائنہ اور ہر شخص کا امتحان خود نہ کر لوں، کالج کے متعلق میں ایک لفظ بھی نہیں کہہ سکتا اس کے بعد جو میری رائے ہوگی اس کا اظہار

---

[1] لوگوں نے خدا پر بھی بہتان اُٹھائے ہیں کہ وہ صاحب اولاد ہے۔ حضرتِ رسالت پناہ کو بھی نعوذ باللہ جادوگر کہا ہے۔ جب خدا اور رسول بدگویوں کی زبان سے نہ بچے تو ہم کس شمار میں ہیں۔

کردوں گا مگر شاید میری رائے تمہیں پسند نہ آئے۔

نواب محسن الملک۔ شب کی تاریکی کے بعد آفتاب کی روشنی کون پسند نہ کریگا۔

مہر مجسٹی۔ الّاخفّاش۔

نواب محسن الملک۔ گر نہ بیند بروز شپرہ چشم   چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

استراحت

اِس مکالمہ کے بعد انٹروڈکشن کا سلسلہ ازسرنو شروع ہوا پھر مسقّف راستہ میں سے دونوں جانب صف بہ صف سیاہ یونیفارم پہنے ہوئے طلبہ کا آداب لیتے ہوئے اپنے کمرہ استراحت یعنی بیک منزل میں تشریف لے گئے۔

نواب محسن الملک کی طلبی اور سوالات وجوابات

تقریبًا پاؤ گھنٹہ آرام فرمانے کے بعد نواب محسن الملک بہادر کی طلبی ہوئی اور کالج کے متعلق مختلف حالات دریافت فرماتے رہے تعلیم دینیات کے متعلق خصوصیت کے ساتھ بہت دقیق سوالات کئے اور نواب محسن الملک برجستہ و خاطر خواہ جوابات دیتے رہے۔

مہر مجسٹی۔ عام درسگاہوں اور انگریزی خوانوں کے لئے اس کی ضرورت ہے کہ انہیں دینیات کی اتنی تعلیم دی جائے کہ وہ اسلامی اصول اور اسلامی عقائد اور اسلامی احکام سے جو متعلق عبادت ہوں واقف ہو جائیں اور اسلام کی حقیقت اور اس کی سچائی کا انھیں یقین ہو تاکہ وہ مسلمان رہیں اور اسلامی مذہب پر ثابت قدم رہ سکیں۔

نواب محسن الملک۔ اس کا انتظام یہاں پہلے سے موجود ہے۔

مہر مجسٹی۔ میں جب تک بذات خود امتحان اور تحقیق نہ کرلوں کوئی رائے ظاہر نہیں کرسکتا میں دو حیثیت سے کالج دیکھ سکتا ہوں، ایک بطور ممتحن کے دوسرے بطور سیّاح کے، پہلی حیثیت سے ضرور ہے کہ ہر بات کی تحقیق و تفتیش اور طلبہ کا امتحان کرکے میں اپنی رائے ظاہر کروں اور دوسری صورت میں معمولی اور رسمی طور پر کالج کو دیکھکر رخصت ہو جاؤں اب بتاؤ ان دو باتوں میں سے تم کسے ترجیح دیتے ہو؟ میری اچھی یا بری رائے امتحان

لینے پر منحصر ہوگی۔

نواب محسن الملک - تمام ٹرسٹیان کالج یہ بات پسند کریں گے کہ اعلیٰ حضرت بحیثیت شاہِ افغانستان اور مذہبی عالم ہونے کے پورا امتحان لیں اگر حضور نے کالج کو قابلِ اطمینان پایا تو جو رائے حضور ظاہر فرمائیں گے کالج کے لئے ایک بابرکت اور انمول سند ہوگی اور پھر کسی کو کالج کی تعلیم دینیات پر غلط الزام لگانے کی جرأت نہ ہوگی اگر اعلیحضرت نے کچھ نقائص معلوم کئے تو اُن کا اظہار بھی ان نقائص کی اصلاح کے لئے مفید ہوگا۔

.... حضور شاہزادہ ولیعہد، ولیعہد بیگم نے پچھلی تشریف آوری کے موقع پر ٹرسٹیان کالج کے ساتھ لنچ تناول فرمایا تھا امید ہے کہ اعلیٰ حضرت بھی ٹرسٹیوں کو یہ افتخار عطا فرمائیں گے۔

ہز مجسٹی - میں جب تک جانچ پڑتال نہ کرلوں اور میری تحقیق میں کالج پسند کے قابل ہو میں تمہارے ساتھ شریک طعام نہیں ہوسکتا۔

یہ سادہ اور صاف جواب سن کر نواب صاحب انگشت بدنداں رہ گئے یہ وقت حقیقتاً بڑی سخت آزمائش کا تھا۔

معائنہ

لنچ کے بعد اعلیٰ حضرت کالج کے معائنہ کے لئے تشریف لے گئے۔ پہلے پختہ بارگ کے بعض کمروں میں اندر جاکر لڑکوں کا طریق بود و باش ملاحظہ فرمایا۔ سالار منزل سے نکل کر نواب محسن الملک اور سرہنری میکموہن کو اپنی گاڑی میں بٹھایا اور انگلش ہاؤس میں پہنچ کر بچوں کے سونے، کھانے، نماز، غسل اور سبق یاد کرنے کے کمرے ملاحظہ کئے اور فرمایا "لوگ مسلمان بچوں کے اس طرح رہنے سہنے پر کیوں معترض ہیں؟ اگر مسلمان بچے اسلامی عقائد سے واقف ہیں اور ارکان اسلام کے پابند۔ تو جو چاہیں پڑھیں اور جس طرح چاہیں رہیں اس میں کچھ ہرج نہیں۔

مسٹر ریس ہاؤس ماسٹر نے وہ الماری دکھائی جس میں قرآن پاک اور سیپارے

رکھے تھے۔ اعلیٰحضرت نے فرمایا "میں کلام پاک بالائے طاق دیکھنے نہیں آیا ہوں، میں اس کا متلاشی ہوں کہ بچے انہیں پڑھتے ہیں یا نہیں" مسٹر ریس نے چار لڑکے بغرض امتحان اعلیٰحضرت کی خدمت میں پیش کئے۔ ہز مجسٹی نے فرمایا "میں آپ کے منتخب کردہ لڑکوں کا امتحان نہیں لینا چاہتا، میں خود لڑکوں کا انتخاب کروں گا"

نماز ظہر یہاں سے واپس ہوکر اعلیٰحضرت نماز ظہر کے لئے مسجد میں تشریف لیگئے[ف] جہاں سیکڑوں مسلمان کھڑے تھے جو دور دور سے ایک بادشاہِ وقت کو اللہ جل جلالہٗ کے دربار میں سربسجود دیکھنے آئے تھے اور جن میں علماء، فضلا اور صوفیہ کرام بھی خاصی تعداد میں موجود تھے۔

امتحانِ دینیات نماز کے بعد نظام میوزیم میں طریق تعلیم ملاحظہ فرمانے کے بعد اعلیٰحضرت نے فرمایا کہ:۔

"اب میں تعلیم دینیات دیکھنا چاہتا ہوں"

چنانچہ مولوی عباس حسین معلّم دینیات شیعہ طلبہ کی ایک جماعت لیکر حاضر ہوئے۔ اعلیحضرت نے طالب علم سے سوال کیا۔ بنائے مسلمانی چند است؟

[ف] ان سب کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اعلیٰحضرت اور ان کے سردار اپنے بوٹ پہنے ہوئے نہایت بے تکلفی کے ساتھ مسجد میں تشریف لے گئے۔

نماز سے فارغ ہونے کے بعد مسجد سے واپسی میں اعلیحضرت کے ایک ہمراہی سردار نے کالجیٹ اسکول کے ایک طالب علم سے دریافت فرمایا "تم نے نماز پڑھی تھی؟"

طالب علم۔ جی ہاں، پڑھی تھی۔

سردار۔ آج امیر صاحب کو دکھانے کے لئے پڑھی تھی یا کل بھی پڑھوگے۔

طالب علم۔ آج تو میں نے اپنی خوشی سے پڑھی تھی، اگر نہ پڑھتا تو کوئی پوچھنے والا نہ تھا لیکن اگر کل نہ پڑھوں گا تو جرمانہ ہوگا اور مار بھی پڑے گی۔

طالب علم - "پنج - توحید، عدل ...." لڑکا یہیں تک کہنے پایا تھا کہ اعلیٰ حضرت متعجب ہوئے۔

نواب محسن الملک - یہ جماعت شیعہ طلبہ کی ہے۔

اعلیٰ حضرت نے سُنّی طلبہ پیش کرنے کی فرمائش کی۔ چنانچہ مولوی عبداللہ صاحب انصاری مرحوم کالج و اسکول کے پچاس سے زائد سنّی طلبہ جو اس وقت فراہم ہو سکے لیکر حاضر ہوئے۔

اعلیٰ حضرت نے ان میں سے چند طلبا انتخاب کئے اور ان میں سے اپنے پاس بلا کر سوالات کئے، جنھوں نے بالعموم صحیح جواب دئے، بجز دو ایک سوالات کے جن کے متعلق خود اعلیٰ حضرت نے فرمایا کہ: - "دخیلے سخت است"

قرأت قرآن اور ایک پُر عظمت نظارہ۔

اِس کے بعد اعلیٰ حضرت نے ایک طالب علم علی الدین کو اپنے پاس بُلا کر بٹھایا اور فرمایا "قرآن مجید میں سے تمہیں جو کچھ یاد ہو، سُناؤ"

کسی کو وہم و گمان بھی نہ تھا کہ یہ جزو ضعیف، شیر افغانستان کو زار و قطار رُلا کر اُٹھیگا اُس نے نہایت خوش الحانی کے ساتھ مصری لہجہ میں اعوذ باللہ اور بسم اللہ کے بعد سورۂ عمران کا یہ رکوع شروع کیا: - اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ الخ دو چار ہی آیتوں کے بعد ایک پُر عظمت سماں بندھ گیا اور تمام حاضرین پر ایک وجد کی سی کیفیت طاری ہو گئی، اعلیٰ حضرت کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور یہ بہ کر رخساروں اور ڈاڑھی تک چلے آ رہے تھے۔ رکوع ختم ہونے تک دو رُمال آنسوؤں سے تر ہو چکے تھے۔ اعلیٰ حضرت نے فرمایا -

اَلْحَمْدُ لِلّٰہ، اَلْحَمْدُ لِلّٰہ، پھر کرسی سے کھڑے ہو گئے اور نہایت جوش و زور کے ساتھ کبھی اُردو میں، کبھی فارسی میں اور کبھی انگریزی میں بار بار فرماتے تھے "اِس کی جو بدگوئی مجھ سے کی گئی ہے سب غلط اور جھوٹ" "They are liars"

"ہمہ دروغ است وکذب وبدگوئی"

اظہار اطمینان اِس موقع پر نواب محسن الملک کی خوشی و مسرت کا اندازہ لگانا آسان نہیں۔ اعلیٰحضرت نے اِن سے مخاطب ہوکر فرمایا "ہم نے طلبہ کا امتحان لے کر اپنی تشفی کرلی، اب ہمارا جواب ہے کہ سب اچھا اور ہم بہت خوش ...."

کچھ اور فرمانے والے تھے کہ نواب محسن الملک نے عرض کیا کہ "اعلیٰحضرت کے انتظار میں صدہا مسلمان جو مختلف اکناف ہند سے ذوقِ زیارت میں آئے ہیں اسٹریچی ہال میں جمع ہیں اعلیٰحضرت وہیں قدم رنجہ فرمائیں اور اُن کے سامنے ان خیالات کا اظہار ہو تو عین نوازش ہے"۔ چنانچہ اعلیٰحضرت نے یہ منظور فرمایا۔

اِس وقت سر ہنری میکموہن نے کہا "No doubt, your majesty is a good mulla" (کچھ شک نہیں کہ اعلیٰحضرت بڑے مُلّا ہیں)

اعلیٰحضرت نے فرمایا۔ "Yes, I am three things, I am a mulla, I am a soldier, I am a king"

(درست ہے۔ بلکہ میں تین چیز ہوں، میں مُلّا ہوں، میں سپاہی ہوں، میں بادشاہ ہوں)

اسٹریچی ہال میں نطق شاہانہ اِس کے بعد اسٹریچی ہال میں اعلیٰحضرت کی خدمت میں نواب (سر ڈاکٹر) مزمل اللہ خاں نے نہایت بلند اور صاف آواز میں ایڈریس پڑھنا شروع کیا جسے اعلیٰحضرت نے نہایت توجہ کے ساتھ سُنا لیکن صرف اُسی حد تک جہاں سے تعلیم دینیات کا ذکر شروع ہوا تھا۔ اعلیٰحضرت نے فرمایا "میں خود دینیات کا امتحان لے چکا ہوں۔ شنیدہ کے بود مانند دیدہ"، پھر کھڑے ہوکر تقریر فرمائی۔ دَوران تقریر میں حاضرین کا جوش وخروش برابر ظاہر ہوتا تھا۔ ترجمان نے جو اعلیٰحضرت کے پاس کھڑا ہوا لفظ بہ لفظ اسپیچ کا ترجمہ سُنا رہا تھا کئی بار ہاتھ کے اشارے سے حاضرین کے جوش وخروش کو روکنا چاہا لیکن اعلیٰحضرت نے فرمایا

"منع نہ کرو جیسے ان کا دل چاہے چیرز دینے دو" اِس پر چیرز اور خوشی کے نعروں کا وہ زور ہوا کہ دیر تک اسٹریچی ہال گونجتا رہا۔ نطق شاہانہ ختم ہونے کے بعد

ایڈریس ایک نقرئی صندوقچہ میں رکھکر نواب ممتاز الدولہ نے پیش کیا جو دہلی کی کاریگری اور سادہ کاری کا اعلیٰ نمونہ تھا اور جس میں کالج کی عمارات، مسجد، صدر دروازہ، اسٹریچی ہال، مقبرہ، سر سید کی تصویریں اور دولت افغانستان کے نشانِ محراب و ممبر اور کالج کے ہلال و کھجور اور تاج کی تصاویر ہاتھی دانت پر بنائی گئی تھیں اور گول اور بیضوی شفاف آئینوں میں جڑی ہوئی جھلک رہی تھیں۔ اندر سب سے اوپر اعلیٰ حضرت کی اور اُس کے نیچے سر سید مرحوم کی اور اس کے دونوں جانب نواب فیاض علی خاں اور نواب محسن الملک کی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔

ڈنر اور مراجعت اِس کے بعد اعلیٰ حضرت بیگ منزل میں بغرض آرام تشریف لے گئے بعد مغرب کالج کی جملہ عمارات اور احاطہ میں چراغاں کیا گیا۔ ڈنر کے لئے ساڑھے سات بجے کا وقت مقرر تھا اس سے پیشتر اعلیٰ حضرت نے نواب فیاض علیخاں بہادر نواب محسن الملک، نواب مزمل اللہ خاں، نواب وقار الملک، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں اور شیخ عبداللہ کو باریابی کی عزت بخشی اور مبلغ بیس ہزار روپیہ کے کرنسی نوٹ بابت عطیہ یکمشت اور چھ ہزار نقد ایک سال کے عطیہ دوامی کی بابت پیشگی عطا فرمائے اور اپنے دستِ مبارک سے کالج کے متعلق اپنی تحریری رائے مرحمت فرمائی۔ ڈنر کے بعد اعلیٰ حضرت نے ٹرسٹیوں کا شکریہ ادا کیا خوشنودی ظاہر کی مولانا حالی مرحوم کا قصیدہ سُنا جس کا ایک شعر اِس باب کے عنوان پر درج ہے۔

ڈنر سے فارغ ہوکر اعلیٰ حضرت نے بیگ منزل میں نماز عشا پڑھی پھر طلبہ و مہمانوں کے ہجوم اور صفوں میں گذرتے ہوئے صدر دروازہ پر تشریف لائے اور الوداع کہکر ریلوے اسٹیشن کو رخصت فرما ہوئے۔

برکت قدوم

علاوہ اُس شاہانہ عطیہ کے جو ہز مجسٹی نے مرحمت فرمایا حاجی احمد سعید خاں (مرحوم) رئیس بھیکم پور نے اعلیٰحضرت کی یادگار تشریف آوری قائم کرنے کے لئے دس ہزار روپیہ کا سید سردار علی رئیس بمبئی نے عربک اسکالرشپ کے لئے سات ہزار روپیہ کا اور راجہ نوشاد علی خاں (لکھنؤ) نے زنانہ تعلیم کے لئے تین ہزار کا اعلان کیا۔

اوّل الذکر کے مصرف کی بابت منشا رشاہی دریافت کرنے پر اعلیٰحضرت نے جواب دیا کہ اس روپیہ کی آمدنی فقہ کی تعلیم میں صرف کی جائے۔

اِن مالی فوائد کے علاوہ غیر متوقع اخلاقی کامیابی کی قیمت کا کوئی اندازہ ہی نہیں ہو سکتا۔

محسن الملک کی کامیابی

امیر افغانستان کی تشریف آوری کسی بھولے بھالے مشرقی حکمراں کی آمد نہ تھی جو ظاہری زیبائش و آرائش اور تکلفات سے متاثر و مسرور ہو جاتا ہے نہ ایک مغربی وزیٹر کی آمد تھی جو مغرب کے طرز تعلیم اور طریقوں سے قدرتی طور پر مانوس اور ان کا قدرداں ہوتا ہے یہ آمد ان دونوں صورتوں سے مختلف تھی، اُس کثرت سے کالج کی مخالف باتیں سمع اقدس تک پہونچائی گئی تھیں کہ اس کے مسلمہ اصول و فوائد کا ذہن نشین کرنا بھی دشوار تھا کالج کی آئندہ قسمت اور قومی منزلت شاہ افغانستان کی رائے پر منحصر تھی مگر نواب محسن الملک کے ساتھ تائید غیبی تھی ان کی تمام قابلیتیں اپنے پورے زور و قوت کے ساتھ حسب معمول مشکلات کی مقاومت کے لئے جمع تھیں اُنھوں نے ہر موقع پر اُن سے کام لیا اور کامیاب ہوئے خدا نے اُنکی کوششوں میں برکت دی اور مشکور کیا۔

نوٹ۔ غالباً عطیات یادگار غیر سود لئے رہتے دس ہزار اور سات ہزار کی رقوم حسابات میں نظر نہیں آتیں۔

کوششوں کے نتائج

تعداد طلبہ میں اضافہ کالج کی شہرت، وظائف کا اہتمام اور نواب صاحب کی کوششوں کا لازمی نتیجہ تھا کہ ہر حصۂ ہند سے جوق جوق طلبا اپنے قومی کالج میں داخل ہوں۔ چنانچہ ۱۹۰۶ء کے سیشن میں یو، پی۔ پنجاب، بلوچستان، برما چترال، ٹرانسوال، بہار و بنگال، متوسط و برار، مدراس اور بمبئی کے ۸۹ طالب علم تھے ان میں نوابانِ مرشد آباد، ڈھاکہ، بیگم پلی مدراس، سچین، مانگرول، سورت، کے صاحبزادے بھی شامل تھے۔

اسٹاف کا اضافہ اور حقوق تعداد طلبا اور ضروریات تعلیم کے لحاظ سے مینجنگ اسٹاف کا اضافہ ہوا مشاہرات کے گریڈ مقرر کئے گئے اور بونس سسٹم جاری کیا گیا۔

عربی اور سائنس کے شعبے ۱۹۰۴ء عربی تعلیم کا شعبہ جاری کیا گیا لیکن اس وقت تک مسلمانوں میں سائنس کی تعلیم بہت کم تھی علی گڑھ میں برائے نام انتظام تھا۔ ہز رائل ہائینس شہزادہ ویلز کی تشریف آوری کے موقع پر نواب محسن الملک نے ایک انسٹی ٹیوشن کی تجویز پیش کی اور ۱۹۰۶ء میں پرنس آف ویلز سائنس اسکول قائم ہو گیا۔

۱؎ یہ تعداد جو روز افزوں ترقی کر رہی تھی مگر انگلش اسٹاف کے سلئے تردد کا باعث تھی اور چونکہ داخلہ کا تعلق پرنسپل سے تھا اس لئے مارسین صاحب اکثر آنریری سکریٹری کے علم و اطلاع بغیر چپکے چپکے درخواستیں نامنظور کرتے رہتے تھے اور ۱۹۰۷ء کی اسٹرائک کے بعد تو وزیٹر کی حیثیت سے انہوں نے صاف طور پر اپنی رائے ظاہر کر دی تھی کہ "میں ٹرسٹیوں سے سرگرمی کے ساتھ التجا کرتا ہوں کہ جو سچا علاج ہو وہ کریں یعنی کالج میں جو طلبہ داخل ہوں اُن کی تعداد کو محدود کیا جائے"

مذہبی تعلیم مذہبی تعلیم کا انتظام بہتر بنانے کے لئے علما کی ایک کمیٹی قائم کرائی اب تک صرف ۳۰ منٹ فی ہفتہ مذہبی تعلیم کے لئے تھا، انہوں نے روزانہ ایک گھنٹہ ٹائم ٹیبل میں رکھوایا امتحانات کے لئے باہر کے علما مقرر کئے۔ ان کا خیال تھا کہ کالج کلاسوں کی تعلیم کے لئے ایک روشن خیال اور معقولی فلسفی عالم کا تقرر کیا جائے مگر بعض رفقا کے ذاتی تعصّبات و رجحانات نے مجبور رکھا البتہ جہاں تک وقت اور موقع ملا خود تقریریں کرتے اور لیکچر دیتے رہے۔

نقد و سالانہ امدادیں مالی لحاظ سے بھی کامیابی پیش پیش تھی اکثر امراء تجار نے بڑی بڑی رقوم عطیات میں دیں۔ ۱۹۰۶ء میں پہلا موقع تھا کہ کالج کو ایک لاکھ روپیہ کی یکمشت اور نقد رقم ملی، ہز ہائینس سر آغا خاں نے آٹھ ہزار پانسو کی گرانٹ مقرر کی، جاورہ سے ایک ہزار دو سو، مالیر کوٹلہ اور محمود آباد سے چھ چھ سو، بھاولپور سے دو ہزار اور افغانستان سے چھ ہزار روپیہ سالانہ مقرر ہوئے، رامپور کے یومیہ میں بارہ سو روپیہ سالانہ کا اضافہ ہوا گورنمنٹ نے بھی گرانٹ ان ایڈ میں اضافہ کیا جو تینتیس ہزار سالانہ تک پہنچی۔

تکمیل و تعمیر عمارات نواب محسن الملک نے قرضوں اور امانتوں کا حساب پاک کرنے کے بعد جس کی مجموعی رقم مع سود ایک لاکھ تریسٹھ ہزار تھی عمارات کی تکمیل و تعمیر شروع کی اور ۱۹۰۰ء سے ۱۹۰۶ء تک صدر دروازہ کے مغربی جانب ۱۷ کمرے ڈ یپچر (مارسین کورٹ) کے سات کمرے اور ایک ہال کی تعمیر کی گئی اور اسکول میں چار جدید کمرے اضافہ کئے گئے۔

لٹن لائبریری، حمید منزل، برکت علی خاں لیکچر روم، آسمان منزل، نظام میوزیم کی تکمیل ہوئی۔

میکڈانل ہاؤس، کرزن ہاسپٹل، ممتاز لاٹوش ہاؤس، آرنلڈ ہاؤس، بالاخانہ

صدر دروازہ، بینک منزل کی جدید عمارتیں تعمیر کی گئیں۔ احاطہ کی بہت سی جالیاں نہیں بعض دیگر نئی عمارتوں کی بنیاد ڈالی گئی اور ان پر کام شروع کیا گیا۔ ایک بہت بڑا قطعہ اراضی ۲۱۳ بیگہ کا جہاں اب سائنس کالج ہے حاصل کیا اور صاحب باغ کے حصول کی کارروائی شروع کی۔

مسجد کی تعمیر کا کام بھی جاری کیا، مینار اور گنبد تیار ہوئے۔

مالی حالت سنہ ۱۸۹۸-۹۹ء تا سنہ ۱۹۰۸ء تک پچیس فنڈ جاری تھے اور ان میں (۱۰۴۳۴۹۱۶) روپیہ نقد وصول ہو چکا تھا اور جو موعودہ تھا وہ بعد کو وصول ہوتا رہا وظائف کے سلسلہ میں الفرض (ڈیوٹی) کو (۱۴۴۵۸۲) اور اسکالرشپ فنڈ میں (۳۰۴۸۸) جملہ (۱۷۵۲۴۰) وصول ہوا۔ سنہ ۱۹۰۸ء کے بجٹ کی رو سے (۱۷۹۴۵۱-۸-۷) آمدنی مع دیگر مدات وظائف تھی اور (۱۷۳۷۲۱) روپیہ سالانہ خرچ تھا۔

تمغۂ طلائی قیصر ہند

نواب صاحب نے حیدرآباد میں حکومت نظام کی جو خدمات کی تھیں وہ بے صلہ نہیں رہیں۔ اعلیٰ حضرت نظام نے ان کو خطابات عطا کئے اور ان میں سے ایک خطاب تو تمام ہندوستان میں اتنا مشہور ہوا کہ اُس کی روشنی اُن کے اصلی نام پر بھی غالب آگئی۔ لیکن برطانوی حکومت میں ان کی خدمات کی قدر و منزلت کا اعتراف ہونے کے باوجود اعزازات حکومت کی فہرست میں ان کا نام نہ آیا۔

اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اُنیسویں صدی کے آخر تک ریاستی عہدداروں کو خطابات دینے میں حکومت محتاط تھی۔ البتہ حیدرآباد کے وزیروں کا تو روایتی حق قائم ہو گیا تھا مگر دوسری ریاستوں میں پانچ چھ بھی خطاب یافتہ نہ تھے۔

برطانوی ہند میں پبلک خدمات کے صلہ میں نواب محسن الملک کو یقیناً استحقاق تھا کہ عام رواج کے مطابق وہ اعزازات سے سرفراز کیے جائیں، چنانچہ سنہ ۱۹۰۱ء میں ان کو تمغۂ طلائی قیصرۂ ہند عطا کیا گیا جو خدمت عام کا ایک قیمتی صلہ ہے اور اکتوبر میں ہز آنر سر جیمس لاٹوش نے کالج وزٹ کے موقع پر حسب قاعدہ وہ تمغہ پہنایا، یہ ایک رسمی بات تھی مگر ہز آنر نے تمغہ پہناتے وقت جو تقریر کی وہ بہت دلچسپ اور معنی خیز تھی۔ انہوں نے فرمایا کہ :۔

"دوسرا فرض یہ ہے کہ میں اپنے دوست آنریری سکریٹری مدرسۃ العلوم علیگڑھ کو تمغۂ طلائی قیصرۂ ہند پہناؤں، جو ہز اکسلینسی وایسرائے ہند نے ان کو عطا فرمایا ہے۔ مجھے اس امر کے اظہار کی ضرورت نہیں کہ یہ عزت صرف اُن لوگوں کو بخشی جاتی ہے جو اپنے ہمعصروں کی بے لوث خدمت کرتے ہیں اور نہایت خلوص کے ساتھ ہندوستان کی فلاح کے لئے اپنے کو وقف کر دیتے ہیں سر سید کی وفات کے بعد سے میں نے مولوی سید مہدی علی خاں کے کارناموں کو بغور دیکھا ہے اور مجھکو معلوم ہے کہ اُن کی جانفشانی، خوش بیانی اور صائب رائے کالج کی غیر معمولی ترقی کی کس قدر باعث ہوئی ہے انہوں نے علی گڑھ میں محسن الملک (یعنی ملک پر احسان کرنے والا) کا خطاب دوبارہ حاصل کیا ہے جس نام سے کہ وہ زیادہ تر مشہور ہیں۔ اَللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْن[1] (زور سے چیرز)۔

اِس کے بعد نواب صاحب نے شکریہ ادا کیا اور تقریر شکریہ میں خدمت و صلہ کے مفہوم پر بھی روشنی ڈالی انہوں نے کہا کہ :۔

جو عزت ہز امپیریل مجسٹی قیصر ہند کی طرف سے مجھے دی گئی ہے میں اس کا

---

[1] تقریر انگریزی میں ہے لیکن ہز آنر عربی سے واقف تھے۔

تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں اور ہر فرد رعیت کے لیے جو عزت کہ اس کے بادشاہ کی طرف سے ملے نہایت فخر اور قدر کے لائق ہے اور مجھے اس کی خوشی زیادہ تر اس وجہ سے ہے کہ اُس مبارک ہاتھ سے مجھے یہ تمغہ ملا ہے جس نے اپنے زمانۂ حکومت میں نہ صرف ایک فرمانروائے صوبہ کی حیثیت سے کام کیا ہے بلکہ بطور ایک محسن اور مربی کے ہر شخص کا لحاظ رکھا ہے اور جس کے زمانۂ حکومت میں ہر ملت و مذہب کے لوگ اس کے احسان و مہربانی اور شفقت سے اُس کے گرویدہ ہو رہے ہیں اور جو احسان کہ مجھ پر آپ نے کئے ہیں وہ بیان نہیں ہو سکتے مگر حضور والا اس کہنے کی میں معافی چاہتا ہوں کہ میرے نزدیک جو شخص کوئی خدمت اپنے ملک اور اپنی قوم کی کرے اُس کی خدمت کا صلہ خود اُس کی خدمت ہونی چاہیئے نہ کہ کوئی خطاب یا ڈکوریشن، اِس لئے کہ اِس سے اُس کی بے ریا اور پاک خدمت میں خودغرضی کا خیال پیدا ہوتا ہے اور دوسرے لوگوں کو بھی۔

صلہ کی خواہش۔ سچے دل سے بے غرض خدمت کرنے پر محدود نہیں رکھتی کاش میں ایسا خوش نصیب ہوتا کہ میری ناچیز خدمت اگر درحقیقت کوئی خدمت ہے کسی صلہ یا تمغہ کے ملنے سے پاک رہتی اور اگر مجھے معلوم ہوتا کہ کوئی صلہ میرے لئے تجویز کیا جاتا ہے تو میں نہایت ادب سے اس کی معافی چاہتا۔ مگر اس سے حضور یہ خیال نہ فرمادیں کہ اس شاہی عطیہ کی میں قدر نہیں کرتا بلکہ میں درحقیقت اسکی بڑی عزّت کرتا ہوں اور اس خیال سے کہ یہ بڑا ثبوت آپ کی خوشنودی اور مہربانی کا ہے۔ سب کا نہایت شکرگزار ہوں۔

حضور والا! آپ نے اپنے زمانۂ حکومت میں جو احسان کالج پر کئے ہیں اور آپ کے مبارک عہد میں کالج نے جس قدر ترقی کی ہے اُس کے عام مسلمان جو اس وقت موجود ہیں ممنون ہیں اور آئندہ اُن کی نسلیں شکرگزار رہیں گی اور آپ کا

نام نامی ہمیشہ مسلمانوں کے صفحۂ دل پر کندہ رہیگا ہم سب کی دعا ہے کہ خداوند عالم آپ کو اپنے وطن میں شاد اور تندرست رکھے اور آپ اپنے وطن میں بھی ہم کو اور ہمارے کالج کو یاد اور اُس کی مدد کرتے رہیں "

ہز آنر سر جیمس لاٹوش کی مہربانیاں

اس میں کوئی شک نہیں کہ ابتدا سے آج تک بہت سے جلیل القدر انگریز حکام نے جن میں ویسرائے یا گورنران صوبہ اور دیگر افسر سب ہی ہیں، اِس ادارہ پر بڑی بڑی مہربانیاں کی ہیں لیکن اُن سب میں سر جیمس لاٹوش کی مہربانیاں سب سے زیادہ اخلاص و جوش اور محبت قلبی کے ساتھ تھیں اُن کو عام مسلمانوں کی ترقی سے دلچسپی تھی، سرسید اور نواب محسن الملک کے ساتھ مخلصانہ الفت تھی اور اس ادارہ کی بہبودی سے دلی تعلق تھا، انھوں نے سرسید کی رحلت کے بعد جو خطرات عظیم تھے اُن کے دور کرنے میں آنریری سکریٹری کی ہر موقع پر معاونت کی، اُن کی ذاتی نیکی اور سچی محبت مختلف صورتوں میں جلوہ گر رہی وہ چار مرتبہ علی گڑھ آئے اور ہر مرتبہ امیدوں کا پیغام اور اُمیدوں کی خوشی ساتھ لائے۔

یوں تو ان کے جذبات ان کی پبلک تقریروں سے بھی معلوم ہوتے ہیں لیکن اِس موقع پر اُن کا ایک پرائیویٹ خط بہت زیادہ دلچسپی سے پڑھا جائیگا ایسے ہی خطوط اصلی جذبات کا آئینہ ہوتے ہیں۔

ہز آنر کا پرائیویٹ خط موسومہ نواب محسن الملک

۴ ہر جون ۱۹۰۵ء مسٹر بٹلر آپ کے کل کے خطوں کا جواب ارسال کر رہے ہیں لیکن میں مناسب خیال کرتا ہوں کہ آپ کی اس اہم کامیابی پر جو آپ نے رنگون میں حاصل کی اور نیز اُس زبردست اطمینان بخش نتیجہ پر جو کہ ایجوکیشنل کانفرنس منعقدۂ لکھنؤ سے حاصل ہوا اپنے قلم سے آپ کو اپنی دلی مبارکباد کا خط لکھوں، مسٹر بٹلر نے مجھ سے کانفرنس کے متعلق بہت کچھ کہا ہے اور مجھے اِس کے یقین کرنے میں کوئی شک نہیں کہ وہ صرف

آپ کی تقریر کا اثر تھا جس نے حاضرین کے خوابیدہ جذبات کو بیدار کر دیا میں ۸ رکو لکھنؤ میں ہوں گا اور مجھے امید ہے کہ جب کبھی آپ لکھنؤ آئیں گے تو آپ سے ملاقات ہو گی۔

آج مسٹر فیاض[۵۱] علی خاں سی، ایس، آئی نے مجھے اطلاع دی ہے کہ وہ آپ کو اپنے اس ارادہ کے متعلق تحریر کرنے والے ہیں کہ آپ "اس بات کا اعلان کر دیں کہ وہ ایم، اے، او، کالج علی گڑھ میں ایک بورڈنگ[۵۲] ہاؤس بیس[۵۳] ہزار روپیہ کے صرف سے جو خود دیں گے تعمیر کرانا چاہتے ہیں"

غالباً آپ کو یقین ہو گیا ہوگا کہ میں کالج کا مخلص حقیقی دہی خواہ ہوں اور میری طرف سے آپ کو اس بات کے یقین دلانے کی چنداں ضرورت باقی نہیں۔

مذہبی خدمات اور مذہبی تعلیم کی حمایت

مذہبی خدمات یہ ایک عام غلطی شائع ہو رہی ہے کہ جب کوئی شخص کسی ایک مذہب کی جزئیات اور کلیات کا عالم ہوتا ہے تو لوگ اس کو مذہبی عالم کہنے لگتے ہیں، حالاں کہ وہ نفس مذہب کی نسبت نہیں جانتا کہ وہ دنیا میں کس طرح پیدا ہوا اور اس میں تغیر اور انقلابات کن وجوہ سے پیدا ہوئے۔ دنیا میں تمام مذاہب کی ترقی اور تنزل کیوں کر ہوئی۔ کیوں وہ بن کر بگڑ گئے۔ اس کو سوائے اپنے مذہب کے دنیا کے اور مذہبوں کی تاریخ سے لاعلمی ہوتی ہے، ہر مذہب دنیا کے کل مذاہب کی ایک جزئی (شکل) ہے پس کوئی شخص ایک مذہب کے جزئیات اور کلیات جاننے سے مذہبی عالم کہلائے جانے کا مستحق نہیں ہے تاجب تک وہ نفس مذہب کے حقائق سے آگاہ نہو۔

---

[۵۱] ممتاز الدولہ نواب سر۔

[۵۲] ممتاز لاٹوش بورڈنگ ہاؤس۔

[۵۳] ۲۰ ہزار کو بڑھا کر اسی ہزار روپیہ کئے جس سے یہ عمارت تعمیر ہوئی۔

یہ صفت مولوی مہدی علی میں بھی کہ وہ حقیقت میں مذہبی عالم تھا وہ فقط مسلمانوں کے شیعہ اور سنّی وغیرہ فرقوں کے مذہب ہی سے خوب واقف نہ تھا بلکہ وہ دنیا کے تمام مذاہب کے حقائق سے آگاہ تھا، اس نے دنیا کے مذاہب کا علم حاصل کرنے کے لئے اپنا بہت سا وقت انگریزی کتابوں کے مطالعہ میں خرچ کیا تھا اور بعض کتابوں کے ترجمہ کرانے میں اپنا روپیہ بھی صرف کیا تھا۔ دنیا کے تمام مذاہب کی تاریخ اس کے ذہن میں ایسی موجود تھی جیسی کہ اپنے مذہب کی۔ وہ اور مذاہب کو جان کر اسلام کی برتری اُن پر ثابت کرتا تھا وہ مسلمانوں کے تمام تعصّبات اور توہمات کو قرآن اور حدیث اور علما کے اقوال سے استدلال کرکے دور کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ وہ قرآن اور حدیث کے موافق وہ مذہبی اصلاحیں بتاتا تھا جن کا ہونا اس زمانہ میں ضروری ہے۔ وہ موجد اس علم کلام کا تھا جس کی اشد ضرورت اس زمانہ میں اسلام کے لئے ہے۔ اس پاک نفس عالم کی کوشش کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب اسی کے طریقۂ استدلال کی پیروی شروع ہوگئی ہے اور آیندہ اور ہوتی جائے گی اور اُس کی تمام تصنیفات کی قدر بڑھتی جائے گی اُس نے قرآن شریف اور حدیث کے موافق اسلام کی ایسی شکل دکھائی کہ مہذّب قوموں میں اسلام کی نسبت جو غلط رائیں دی جاتی تھیں وہ بدل گئیں۔

(شمس العلما مولوی ذکاء اللہ مرحوم)

مذہبی تصنیفات و تالیفات

اس سلسلہ میں نواب صاحب نے بجز آیاتِ بیّنات[51] اور کتاب المحبّت والشوق[52] کے کوئی اور تصنیف و

---

[51] یہ کتاب سنہ ۱۲۸۷ھ میں شائع ہوئی اس کے اعلام اور دیباچہ میں اس کا موضوع اور سبب تالیف بیان کیا گیا ہے شیعہ سنّی کے مباحث میں اس کی خاص عظمت ہے۔

[52] احیاء العلوم کی کتاب المحبت کا انتخاب ہے اور مثنوی مولانا روم کی حکایتیں اور اشعار اور بعض موقعوں پر دیگر کتب کے مضامین سے اقتباسات بھی شامل ہیں۔

وتالیف نہیں چھوڑی، لیکن وہ مضامین جو تہذیب الاخلاق میں شائع ہوئے بجائے خود مستقل رسائل ہیں اور ان کے مطالعہ سے مولوی ذکار اللہ خاں نے جو کچھ مذہبی خدمات کے متعلق لکھا ہے اس کی لفظ بہ لفظ تصدیق وتائید ہوتی ہے۔

ندوہ کی تائید

۱۸۹۳ء میں جب چند روشن خیال علما نے رفع نزاع باہمی کے لئے ندوۃ العلمار اور طریقہ تعلیم عربی کی اصلاح کے لئے قیام دارالعلوم ندوہ کی تحریک کی تو ۱۸۹۴ء کے اجلاس کانفرنس منعقدہ علی گڑھ میں نواب محسن الملک نے اس تحریک کی امداد کے لئے ایک رزولیوشن پیش کیا اور ایک پُر لطف تمہید کے بعد قوم کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ:-

حضرات علما نے زمانہ کی ضرورت کو دیکھا اور ہماری اصلاح وترقی پر متوجہ ہوئے یہی ہماری خواہش تھی اور یہی ہمارا مقصود ہے، خواہ وہ ایجوکیشنل کانفرنس کے نام سے ہو یا ندوۃ العلمار کے مبارک لقب سے اور اُس کے لئے ہم علی گڑھ میں جمع ہوں یا کانپور میں

شاخ گُل ہر جا کہ روید ہم گُل است | خم مُل ہر جا کہ جوشد ہم مُل است
گر ز مغرب بر زند خورشید سر | عین خورشید است نے چیزے دگر

پھر اُنہوں نے علما کی کوششوں تحفظ علوم مذہب کی ضرورتوں اور مسلمانوں کی قدیم علمی مساعی پر تقریباً ایک گھنٹہ تقریر کی، اس کے اثر سے تعلیم یافتہ طبقہ اور تعلیم جدید کے حامیوں میں تحریک ندوہ کے ساتھ خاص دلچسپی پیدا ہو گئی۔

اس کے بعد جب سر انٹونی میکڈانل کی حکومت میں یہ تحریک مشتبہ نظر آئی علما پر مخفی پولیس تعینات ہوئی اور ۱۹۰۰ء میں ایم، اے، او، کالج کی وزٹ کے موقع پر ہز آنر نے حسب ذیل فقرہ سے تحریک ندوہ سے اظہار ناپسندیدگی کیا کہ:-

"آپ کے مطالب کی تکمیل بوجہ احسن اپنی ذات پر بھروسہ کرنے اور اپنے کو ان ہتیاروں سے مسلح کرنے سے ہوگی جو زمانہ حال کی تعلیم کے ذریعہ سے حاصل

ہوتے ہیں آپ کو کفر و الحاد کے الزام کے اندیشہ سے یا ندوہ کی اس خواہش سے کہ آپ پرانے قاعدوں پر قائم رہیں اپنے پچھلے مقصد سے منحرف ہونا مناسب نہیں ہے، قومی صلاح اس طریقہ سے نہیں ہوتی ہے اور زمانہ حال کی لڑائی جدید ہتیاروں کے ذریعہ سے لڑنا چاہیئے"

تو کمزوروں پر ایک خوف طاری ہوگیا خود علی گڑھ میں نوجوانوں کی ایک جماعت مخالف ہوگئی مگر نواب محسن الملک اپنی رائے پر قائم رہے، انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں ندوہ کی تائید کی اور مہر آنر کی تقریر کا ازالہ کرنے کے لئے ایک نہایت پرزور مضمون لکھا اور پھر ۱۹۰۲ء میں یونیورسٹی کمیشن میں جو بیان دیا اس میں بھی تائید و ستائش کی۔

بچپن میں مذہبی تعلیم پر رائے نواب محسن الملک کے نزدیک مذہبی تعلیم اور خاص کر بچپن کی تعلیم نہایت اہمیت رکھتی تھی لیکن مسلمانوں میں ایک جماعت بچپن میں مذہبی تعلیم کو ہندوؤں کے مقابلہ میں پیچھے رہ جانے کا باعث تصور کرتی ہے جو بعض غیر مسلم ماہرین تعلیم کے خیالات کا عکس ہے۔ چنانچہ ۱۹۰۶ء میں جب شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ خاں (مرحوم) نے اس قسم کے خیالات اخبار میں ظاہر کئے تو نواب صاحب نے ان کی تردید میں قلم اٹھایا اور انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں ایک نہایت پرزور اور دلچسپ مضمون لکھکر اسی عمر میں اس کی ضرورت و اہمیت ظاہر کی۔ اب کہ بچپن میں مذہبی تعلیم نہ دینے کے نتائج نمایاں ہورہے ہیں ان کی خیالات و آرا کی صحت اور اس ضرورت و اہمیت کا ہر روز ایک نیا ثبوت ملتا ہے۔

کالج میں مذہبی تقریریں و مواعظ وغیرہ یہی جذبہ خدمت مذہب تھا کہ ۱۸۹۴ء سے ۱۹۰۵ء تک جب موقعہ ملا اسلام پر خود تقریریں کیں مشہور علما کو کالج کی طرف راغب کیا اور ان سے وعظ کرائے اور مذہبی تربیت و تعلیم کا نظام قائم کیا۔

سیاسی خدمات

نواب محسن الملک کے سیاسی افکار و عقائد

فیاض ازل نے نواب محسن الملک کے ذہن و دماغ کو سیاسیات کے لئے خاص طور پر موزوں بنایا تھا، اٹاوہ کی تحصیلداری اور مرزا پور کی ڈپٹی کلکٹری کے زمانہ میں سرسید کے علاوہ مسٹر اے او ہیوم کی تربیت و صحبت میں ہندوستانی سیاسیات کے

لہ مسٹر اے او ہیوم اٹاوہ اور مرزا پور میں کلکٹر تھے جنھوں نے سب سے پہلے آل انڈیا جمعیۃ کا خیال ظاہر کیا، تاکہ وہ ہندوستان کی سیاسی ترقی کے لئے اہل ہند کی عمرانی زندگی میں تازگی پیدا کرے، اُنھوں نے ہی کلکتہ کے گریجویٹوں کے نام ایک مکتوب مفتوح لکھکر اُنھیں ابھارا کہ اس تحریک کی رہبری کریں، وہ نواب محسن الملک کے شفیق و مربی اور اُن کی قابلیت کے بڑے معترف تھے، چنانچہ حیدرآباد جاتے وقت اُنھوں نے جو سارٹیفکٹ دیا تھا اس میں انکی ذہانت ومحنت اور فراست و مستعدی اور زیرکی کے متعلق لکھا تھا کہ " یہ سب صفات ان میں اتنی وسعت کے ساتھ جمع ہیں کہ شاید ہی کسی اور شخص میں ہوں"، نیز اپنے تمام ماتحت ہندوستانی اور انگریز عہدہ داروں کے مقابلہ میں ان کو ترجیح دے کر اور ہر مشکل، دقیق اور نئے کام کو خوبی کے ساتھ انجام دینے کی تعریف کرتے ہوئے تحریر کیا کہ " نہایت تعجب کی بات ہے کہ باوجود اس اعلیٰ درجہ کی لیاقت کارگذاری کے ایسا شخص جو ایک ریاست اور صوبہ کا انتظام نہایت عمدہ طور پر کرسکتا ہے اب تک ایسے ادنیٰ عہدہ پر مامور رہے جیسا کہ تحصیلداری و ڈپٹی مجسٹریٹی کا عہدہ ہے اور وہ لوگ جو اس سے سب صفات میں کمتر ہیں عمدہ اور معزز عہدے پائیں، اب وہ عنقریب سرکار انگریزی کی ملازمت سے مستعفی ہو رہے ہیں، اس لئے کہ اس سرکار سے ہنوز انکی لیاقت کا کوئی نتیجہ نہیں ملا"۔ مؤلف کو مسٹر اے او ہیوم کا ایک خط بھی دستیاب ہوا لیکن اس میں کوئی قابل ذکر بات نہیں تاہم باہمی تعلقات کا ضرور اندازہ ہوتا ہے ۔

ہر پہلو پر ان کو غور و فکر کا موقع ملا تھا لیکن علائق ملازمت کے باعث وہ سیاسی خیالات کے اظہار یا سیاسیات میں عملی حصہ لینے سے معذور رہتے تھے البتہ حیدرآباد کے دورِ ملازمت میں جہاں تک کہ ان کے منصب کا تعلق تھا برٹش انڈیا کے معاملات پر چند مرتبہ اُنہوں نے اپنی رائیں ظاہر کیں روسی پیش قدمی پر ۱۸۸۵ء میں جو مضمون لکھا تھا وہ اگرچہ معتمد سیاسیات دولت آصفیہ کی حیثیت سے تھا مگر اس میں عام مباحث بھی تھے۔

اسی سال کانگریس بھی قائم ہوئی تھی، اس کے ابتدائی مطالبات میں ہندوستانیوں کا اعلیٰ عہدوں پر تقرر بھی ایک اہم مطالبہ تھا۔

سول سروس کمیشن میں شہادت

حکومت اس مطالبہ کو ایک حد تک تسلیم کر چکی تھی اور بتدریج اس کو پورا کیا جا رہا تھا ۱۸۸۶ء میں اسی مقصد کے لئے ایک کمیشن قائم ہوا جس میں شہادت کے لئے نواب محسن الملک بھی منتخب کئے گئے وہ اس مطالبہ کے مؤید تھے اور ان امتیازات کو ناپسند کرتے تھے جو انگریزوں اور ہندوستانیوں کے تقررات میں رکھے جاتے تھے لیکن ملکی حالات کے لحاظ سے تقررات کو "محض مقابلہ" پر منحصر کر دینے کے بھی خلاف تھے، اُنہوں نے ان دونوں امور کے متعلق ایسا مدلل و مؤثر بیان پیش کیا کہ کمیشن کے ایک ممبر مسٹر ٹریور نے اپنے خانگی خط میں اس کی بہت تعریف کی اور اُن کے مرتبہ و مواقع کے لحاظ سے اس کو زیادہ توجہ کا مستحق قرار دیا۔

ان کی رائے ہندوستان و انگلستان دونوں جگہ پسند کی گئی نواب مہدی حسن فتح نواز جنگ نے اپنے ایک خط میں لندن سے اطلاع دی کہ "سول سروس کمیشن کے سامنے آپ کی شہادت کی یہاں بھی بڑی تعریف ہے" آج نصف صدی گذرنے پر بھی یہی اصول قائم ہے اور اسی اصول کی بدولت جب تک کہ مسلمانوں نے تعلیم میں کافی ترقی نہیں کی ان کو اکثر کامیابی ہوئی۔

نیشنل کانگرس سے اختلاف اور اس کے اسباب

نیشنل کانگرس کا پہلا اور باقاعدہ اجلاس ۱۸۸۵ء میں منعقد ہوا دو سال تک اس کے اصول کار پر نظر کرنے کے بعد سر سید نے اس کی مخالفت میں بمقام میرٹھ ۲۸ دسمبر ۱۸۸۷ء کو ایک معرکتہ الآرا لیکچر دیا جو ان کے رفقائے کار اور عام مسلمانوں کی سیاسی پالیسی کا سنگ بنیاد بنا۔ اس موقع پر یہ حقیقت بھی ذہن نشین رکھنی چاہیئے کہ زوال و انتزاع سلطنت مغلیہ کے ساتھ انیسویں صدی شروع ہوتے ہی مسلمانان ہند ایک بڑے سخت دور ابتلا میں داخل ہوئے تھے اگرچہ انہوں نے اپنی قسمت نئی حکومت کے ساتھ وابستہ کر دی تھی لیکن قدرتی طور پر نہ وہ اس قدر جلد عہد ماضی کو بھول سکتے تھے اور نہ حکومت جدید کی بدگمانیوں سے محفوظ رہ سکتے تھے، پھر اگرچہ ہندوستان میں ان کی قوت ختم ہو چکی تھی لیکن ان میں عالمگیر اخوت کا رشتہ تھا دنیا کے دوسرے ملکوں میں ان کی سلطنتیں موجود تھیں اور وہ بحیثیت مسلمان ایک زندہ قوت تھے، ان میں اور عیسائی ممالک میں مذہبی و سیاسی رقابت قائم تھی، بہ ایں وجہ حکومت کو ہندوستان میں جو اطمینان ہندوؤں پر ہو سکتا تھا وہ مسلمانوں کی نسبت جلد حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔

مسلمان ایسٹ انڈیا کمپنی کے تسلط کے بعد امتیازی حقوق و اختیارات سے محروم اور اقتصادی طور پر برباد ہونے کے باوجود اپنی حالت پر قانع ہو گئے تھے اور امید تھی کہ ان پر حکومت کا جلد اعتماد قائم ہو جائے گا لیکن ۱۸۵۷ء کے واقعۂ غدر سے وہ گوناگوں مصیبتوں میں پھنس گئے۔

"انگریزوں[1] میں بہت سے اس بات کے بڑے خواہشمند تھے کہ فتح کے بعد (ہندوستانیوں سے) دل کھول کر انتقام لیں اور ان کے غصہ کی آگ مسلمانوں کے خلاف خاص کر بھڑکی ہوئی تھی جن کی نسبت، بہت لوگوں کا خیال تھا کہ وہ غدر کے محرک ہوئے ہیں"، چنانچہ فتح

---

[1] سر تھیوڈر ماریسن علیگڑھ منتھلی ۱۸۹۸ء

کے بعد مسلمانوں سے دل کھول کر انتقام لیا گیا۔

سرسید[1] کے خاص ہم مذہبوں اور انگریزوں کے درمیان عداوت سب سے زیادہ تھی، ایسے وقت پر کسی شخص کو مسلمانوں کی قوم کی جانب سے اُن وسیلوں کی نسبت بہت کم غور یا توجہ کی توقع تھی جس سے پھر اتفاق ہو سکے اور مصالحت کی بہت کم اُمید یا خواہش ہو سکتی تھی جو مصیبت ہم سب پر پڑی تھی وہ نہایت ہولناک تھی اور جو انتقام قوم کے ایک فرقہ سے لیا گیا اس کے باعث بہت جلد مصالحت کا خیال نہیں ہو سکتا تھا۔"

لیکن سرسید[2] نے جن کو خدا نے اس مصیبت میں ایک نجات دہندہ بنایا تھا اس التہاب انتقام کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی اتفاق کے وسائل پر توجہ دلائی اور مصالحت کی خواہش و اُمید پیدا کر دی۔

یہ کوشش ہنوز پورے طور پر بارور نہ ہوئی تھی کہ بنگال کی وہابی تحریک نے ایک نئی مصیبت میں پھنسا دیا، ہنگامۂ غدر پر بارہ تیرہ سال ہی گذرے تھے کہ مشہور و معروف ڈاکٹر ہنٹر نے "انڈین مسلمانز"[3] لکھ کر ثابت کیا کہ "ہندوستانی مسلمان اب بھی ہندوستان میں گورنمنٹ انگریزی کے لئے موجب خطر ہیں جیسے کہ ایک مدت سے موجب خطر چلے آتے ہیں" مگر وہ ہی نجات دہندہ (سرسید) اس تازہ اُفتاد سے بچانے کے لئے پھر سینہ سپر ہوا اور اسی نے انگلستان و ہندوستان میں اس مہیب شعلہ کو سرد کیا تاہم چنگاریاں زیر خاکستر دبی تھیں بعض مدبرین کبھی کبھی مسلمانوں پر مہدی سوڈانی کی ہمدردی کا الزام رکھتے تھے اور مسلمانی ریاستوں اور شہروں میں جوش اور پولیٹیکل سازشوں کے وجود کو خوفناک صورت میں بیان کرتے تھے۔

یہی زمانہ تھا کہ بنگال کی سیاسی تحریک جو ۱۸۳۲ء میں شروع ہوئی تھی مختلف

---

[1] تقریر ہز آنر سر اکلینڈ کالون لفٹننٹ گورنر صوبہ متحدہ بجواب ایڈریس ٹرسٹیان کالج ۱۸۹۲ء

[2] حیات جاوید۔ [3] ریویو ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر۔

منازل سے گذر کر انڈین نیشنل کانگرس کی صورت میں ملک کے سامنے آئی۔

ابتدا سے اس کی رہبری بنگال کی تعلیم یافتہ جماعت کے ہاتھوں میں تھی اور ۱۸۵۳ء میں ہی ایک انتہا پسند جماعت پیدا ہو چکی تھی ۱۸۷۸ء تک وہ طبقہ جو کامل سیاسی آزادی کا مدعی تھا وجود میں آ گیا تھا بنگال میں اس تحریک پر مختلف دَور گذرے تھے جن کے متعلق بعض اوقات حکومت نے سخت کارروائیاں بھی کی تھیں اور اب کہ اس تحریک نے بنگال سے دوسرے صوبوں تک منظم صورت میں وسعت اختیار کر لی تھی، اس کا اصول و طریق کار حکومت کی نظروں میں خطرناک مقصود ہوا، گورنر جنرل اور صوبے کے گورنروں نے اس کو بغاوت کے مترادف سمجھا۔ دانائی کا اصلی معیار مقتضیات وقت کا لحاظ ہوتا ہے، سرسید نے اپنی پوری طاقت سے مسلمانوں کو اس مُہلک اقدام سے باز رکھا، یہ عاقلانہ پالیسی اس درجہ مقبول ہوئی کہ وہ مسلمان بھی جو اختلاف عقائد کی بنا پر سرسید کی تعلیمی تحریکات سے علیحدہ تھے اسی پر کاربند ہوئے اور کانگرس سے ابرادِ علیحدگی مسلمانوں کی متفقہ پالیسی ہو گئی۔

نواب محسن الملک کا انگلستان میں مسٹر گلیڈاسٹون سے تبادلۂ خیالات

نواب محسن الملک بھی سرسید کے اسی سیاسی عقیدہ کے متبع تھے ۱۸۸۸ء میں جب وہ حکومت نظام کی طرف سے انگلستان گئے تو وہاں لبرل حکومت کا دَور دَورہ تھا، مزدوروں کے حق رائے دہندگی کی جنگ زوروں پر تھی، مسٹر گلیڈاسٹون آئرلینڈ کے لئے ہوم رول کی مہم جاری کر چکے تھے جس سے سیاسیین ہند کی پُرحوصلہ طبائع میں بھی جوش تھا۔ دونوں جگہ تحریک کانگرس کی رفتار، اس کے مطالبات اور مخالف آرا وافکار پر بھی کافی غور و خوض ہو رہا تھا اس موقع پر نواب محسن الملک نے مسٹر گلیڈاسٹون سے ملاقات کی اور اُن سیاسی مسائل پر جن کا تعلق مسلمانوں سے تھا تبادلۂ خیال کیا۔

اِس زمانہ میں انگلستان نے ٹرکی و مصر کے متعلق جو پالیسی اختیار کی تھی اُس سے اسی اخوت اسلامی کی بنا پر مسلمانان ہند کے قلوب بھی بے چین تھے ، قریب قریب اسی عرصہ میں سر سید نے نہایت درد سے کہا تھا[1] کہ :-

"جب بہت سی مسلم سلطنتیں موجود تھیں تو ہمیں ان میں سے ایک سلطنت کی تباہی پر زیادہ افسوس نہیں ہوا تھا لیکن اب جبکہ صرف چند سلطنتیں باقی رہ گئی ہیں ہمیں ان میں سے ایک چھوٹی سی سلطنت کے ضائع ہو جانے کا بھی احساس ہوتا ہے اگر ٹرکی کو فتح کر لیا گیا تو وہ بہت بڑا صدمہ ہوگا کیونکہ وہ اسلام کی دول عظمیٰ میں سے آخری دولت ہے جو باقی بچی ہے ، ہمیں یہ خطرہ ہے کہ کہیں ہم یہودیوں کی طرح ایک ایسی قوم بن کر نہ رہ جائیں جس کا اپنا ملک کوئی بھی نہیں ۔"

اس لئے نواب محسن الملک نے ترکی مسئلہ پر بھی وزیر اعظم کے خیالات معلوم کئے یا اپنے جذبات کا اظہار کیا ، یہ ملاقات اگرچہ دولت نظام کے نمایندے کی حیثیت سے ہوئی تھی لیکن چوں کہ نہایت دلچسپ ہے اور اس کا زیادہ تعلق مسلمانوں کی سیاسیات سے ہے اس لئے اس کی تفصیلی کیفیت لندن ٹائمز سے اخذ کر کے ذیل میں درج کی جاتی ہے :-

مسٹر گلیڈ اسٹون اور نمائندۂ نظام

سر ایچ جیمس کی کمیٹی نے معاملۂ دکن کی جانچ پڑتال ختم کر لی ہے اور اب چونکہ اس سلسلہ کی کارروائی اختتام پذیر ہے اِس لئے ہز ہائینس نظام کے نمایندۂ خصوصی جن کو پیسرڈی مقدمہ کے سلسلہ میں صدر اعظم سر آسمان جاہ نے انگلستان بھیجا تھا ، ہندوستان واپس جا رہے ہیں ، نواب محسن الملک مہدی علی خاں جو پہلے حکومت ہند

[1] پولیٹکل انڈیا مضمون سر تھیوڈر ماریسن -

کے عہدہ دار تھے اور ادھر کچھ عرصہ سے حکومت نظام سے وابستہ ہیں، قوم کے مشہور خادم ہیں، آج کل وہ حیدرآباد کے پولیٹکل اور فنانشل سکریٹری کے اہم عہدہ پر فائز ہیں چونکہ ان کی خواہش یہ تھی کہ وہ ہندوستان واپس ہونے سے پہلے انگلستان کا دورہ کرلیں اس لئے پچھلے ہفتہ اُنھوں نے مسٹر گلیڈ اسٹون کا دعوت نامہ قبول کرلیا جس میں ان کو ہاورڈن کاسل (قصر ہاورڈن) آنے کے لئے مدعو کیا گیا تھا۔ راستہ میں وہ مانچسٹر ٹھہرے، جہاں اُن کا استقبال مسٹر ٹمینل اور مسٹر واڈس نے کیا جن کو شہر کے معاملات و دیگر معززین سے قریبی تعلق تھا محسن الملک نے مختلف اہم و دلچسپ مقامات کی سیر کی، چیسٹر میں میجر رابرٹسن ملے جو کبھی حیدرآباد کے اسسٹنٹ رزیڈنٹ تھے، یہاں سے یہ اصحاب قصر ہاورڈن پہنچے۔ جہاں مسٹر گلیڈ اسٹون نے نہایت تپاک کے ساتھ اُن کی پذیرائی کی۔

ملاقات کی حسب ذیل کیفیت حکومت نظام کی اطلاع کے لئے مرتب کی گئی ہے۔

مسٹر گلیڈ اسٹون نے سلسلۂ گفت و شنید یوں شروع کیا کہ بالعموم وہ ملاقاتیوں سے قصر ہاورڈن میں نہیں ملا کرتے کیونکہ یہاں اُن کو تخلیہ و سکون حاصل کرنے کا موقع ملتا ہے لیکن اس خاص موقع پر آن کو یوں استثنا برتنا پڑا کہ ملاقات ایک ایسے شخص سے ہونیوالی تھی جس کو اپنے وطن میں مخصوص امتیاز و اعزاز حاصل تھا۔

اس کے بعد انھوں نے دریافت کیا کیا آپ کو اکثر انگلستان آنے کا اتفاق ہوتا رہا ہے اور بالخصوص آپ نے لیورپول بھی دیکھا ہے پھر اُنھوں نے دریائے مرسی کے دلچسپ مناظر کا بیان کرتے ہوئے اس کی موجودہ ہیئت اُس کے ڈاک docks کی وسعت جو چھ میل کے رقبہ میں ہے اپنے باپ کے زمانہ سے مقابلہ کیا اور یہ بتایا کہ اگرچہ دریا بہت وسیع ہے لیکن مختلف وجوہ سے پہلے کی بہ نسبت اب بحری تجارت کم ہوتی ہے اور یہ کہ اُن کے والد نے سب سے

پہلے ۱۸۱۲ء میں ایک تجارتی جہاز ٹنگنس مل ، نامی ہندوستان روانہ کیا تھا اور یہ
معلوم کرنے پر کہ مہدی علی کا یہاں سب سے پہلا سفر ہاورڈن کاسل آنے کے لئے تھا
شکریہ ادا کیا اور ہز ہائینس نظام کے نمایندہ سے ملاقات ہونے پر بڑی مسرت ظاہر کی

مولوی مہدی علی نے کہا کہ وہ مسٹر گلیڈاسٹون کا نام اور شہرت ہندوستان اور
انگلستان دونوں میں سُن چکے ہیں ، پھر اُنہوں نے اس خط کا حوالہ دیتے ہوئے جو
مسٹر گلیڈاسٹون نے سالار جنگ[۵] سے اس مضمون کے سلسلہ میں تحریر کیا تھا جو موخرالذکر
نے ایک رسالہ میں لکھا تھا ، کہا کہ میں آپ کا نہایت شکرگزار ہونگا اگر آپ اپنی زبان
سے بھی یہ فرمادیں گے کہ آپ باشندگان ہند سے بالعموم اور اُن کے (مہدیعلی کے)
ہم مذہبوں سے بالخصوص ہمدردی رکھتے ہیں ۔

مسٹر گلیڈاسٹون نے کسی قدر شرح وبسط کے ساتھ اپنے ان دوستانہ اور ہمدردانہ
جذبات کا ذکر کیا جو ہندوستان اور اس کے باشندوں کی طرف سے اُن کے دل میں
موجزن تھے اور یہ بھی فرمایا کہ جو خط اُنہوں نے سالار جنگ کو لکھا تھا اُسے اُن کے اُن
آرا و افکار کا ترجمان تصوّر کیا جاسکتا ہے جن پر وہ اب تک قائم ہیں اور جن میں اب تک
کسی قسم کا تغیّر واقع نہیں ہوا ہے اور اُس پر کچھ اضافہ کرنا نہیں چاہتے ۔

اُن کے لئے یہ امر باعثِ مسرّت ہے کہ ہندوستان کے تمام اربابِ سیاست اس
بات کو رفتہ رفتہ محسوس کر رہے ہیں اور اس پر استواری کے ساتھ قائم ہیں کہ انگریزوں
کا ہندوستان میں قیام صرف اس اعتبار سے جائز اور معتبر ہے کہ وہ ہندوستان کی
صلاح و فلاح کا موجب ہے ۔ ان کو یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ اب تک جتنی تجاویز
اور تدابیر بروئے کار لائی گئی ہیں ، اُن میں اسی مفید اور بصیرت افروز پالیسی کو مدّنظر

---

۵ میر لایق علی خاں عماد السلطنت جب سبکدوش ہونے کے بعد یورپ گئے ہیں تو اس
زمانہ میں یہ مضمون لکھا تھا ۔

رکھا گیا ہے۔

مولوی مہدی علی، آپ ایسے فاضل اور مشہور سیاست داں کی زبان سے یہ خیالات سُن کر مجھے نہایت مسرت حاصل ہوئی۔

مسٹر گلیڈاسٹون، تمام امور سے قطع نظر کر کے میں ان دنوں اپنی تمام تر توجہ اس پر صرف کر رہا ہوں کہ آئرلینڈ کا نظم حکومت کس نوعیت کا ہو۔ رہا ہندوستان کا اندرونی معاملہ اس کے بارے میں میرا خیال ہے کہ ان نوجوانوں کی رائیں جن کو مجھ سے بہتر مواقع غور کرنے کے ملے ہیں زیادہ سود مند ہوں گی۔

مولوی مہدی علی۔ آپ ایسے مقتدر مدبّر کی رائے بہر نوع نہایت درجہ قیمتی ہو گی۔

مسٹر گلیڈاسٹون نے (کسی قدر مایوسانہ) جواب دیا کہ دارالعوام کا ۶۵ سال تک رکن رہنے کے بعد اب میں اپنی سیاسی زندگی کے آخری مرحلہ سے گزر رہا ہوں (از راہ خوش طبعی) آخر "پیک کر اُتر جانا" بھی تو کوئی چیز ہے۔

جب اُن سے یہ سوال کیا گیا کہ انگلستان کے اقتدار کو برقرار رکھنے اور اگر ضرورت پیش آئی تو جنگ کریمیا کی اس پالیسی کو دوہراتے رہیں گے جس سے کہ ترکی کو مدد پہونچے جو کہ ملّت اسلامیہ کا مدعا ہے اور یہ پالیسی نہ صرف اس لئے ہوگی کہ مسلمانان ہند کی ہمدردی حاصل ہو بلکہ مشرق کی طرف روسی پیشقدمی کو روکا جائے۔

مسٹر گلیڈاسٹون نے فرمایا کہ یہ مسئلہ نہایت درجہ اہم اور تفصیلی بحث کا محتاج تھا لیکن قطع نظر اس سے کہ اس پر شرح و بسط سے بحث کی جائے، مجھے اس امر کے اظہار میں مطلق پس و پیش نہیں ہے کہ بذاتہٖ ترکی کی طرف سے میرے جذبات نہایت دوستانہ ہیں، اسکندریہ پر گولہ باری کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ یہ فعل بعض حلقوں میں اس اعتبار سے قابل اعتراض تصور کیا گیا کہ یہ ایک طور پر دولت ترکی کے سرحدی مقبوضات پر حملہ کرنے کا مرادف تھا جس دن گولہ باری ہوئی ہے اس کے قبل کی

شب میں میں ترکی سفیر مسرور پاشا ؟ کے ساتھ شب کے کھانے پر تھا، میں نے اُن کو بتا دیا تھا کہ یہ مصر میں ترکی اثرات کے برسرکار لانے کے لئے راستہ صاف کیا جا رہا تھا، ترکی افواج اس طور پر مصر میں داخل ہو کر خدیو کو بعض ان مضر اور مخرب اثرات سے نجات دلا سکیں گی جن میں وہ گھرے ہوئے تھے، یہ مشورہ ترکی سفیر نے فی الفور بذریعہ تار برقی قسطنطنیہ پہنچایا، لیکن بدقسمتی سے ہز مجسٹی سلطان نے اس کو قبول کرنا مناسب نہیں خیال کیا۔ رہا مصر پر قبضہ اس کے بارے میں قطعاً شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ وہاں افواج صرف اس وقت تک رکھی جائیں گی جب تک ان کا رکھنا اشد ضروری ہو گا، ورنہ ملک فوراً خالی کر دیا جائیگا۔

رہا یہ امر کہ باشندگان ہند کی طرف سے اُن کے خیالات کیا تھے، مسٹر گلیڈاسٹون نے فرمایا کہ میں نے اپنے عہد وزارت میں اپنے پرانے دوست اور رفیق کار لارڈ رپن کا تقرر کیا تھا جنہوں نے ہندوستان کے لئے کتنی مہتم بالشان یادگاریں چھوڑیں، اس کے بعد لارڈ ڈفرن کار فرما ہوئے، جن کو شاید اپنے پیش رو کی طرح مواقع نصیب نہیں ہوئے لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ اپنے پیش رو کے نقش قدم کو خضر راہ بنانے کے لئے ہمیشہ کوشاں اور متمنی رہے۔

مولوی مہدی علی نے کہا کہ جہاں تک ان کے ہم مذہبوں کا تعلق ہے ان کو یقین کامل ہے کہ قدیم سلطنت مغلیہ کی تشکیل ناممکن ہے اور ایک ایسی حکومت جو اُن کے مذہب کا احترام اور ہمت افزائی کرنے کے علاوہ مسلمانوں کو دنیاوی منفعت سے متمتع کرتی ہے بہر نوع اس کی مستحق ہے کہ اس کی اعانت کی جائے اور اس کا دم بھرا جائے اسکے بعد فرمایا کہ ضرورت آن پڑی تو مسلمانوں کے دلوں میں وہی جذبات محبت اور عقیدت موجزن ہوں گے جو مسلمانان ہند کے دلوں میں گذشتہ زمانہ میں موجزن تھے اور اس طور پر برطانوی اقوام کے دوش بدوش وہ مشترک دشمن کے لئے سینہ سپر بھی ہوں گے،

یہ جذبۂ عقیدت حیدرآباد دکن کی نسبت سے اور زیادہ صحیح تھا اور تاج برطانیہ کے ساتھ حیدرآباد دکن کو جو عقیدت ہے وہ اپنی غیر متبدل نوعیت کے اعتبار سے ہمیشہ نمایاں اور ممتاز رہی۔

مولوی مہدی علی نے سر سالار جنگ سابق کا بھی ذکر کیا جن کے آرا اور عقائد سے مسٹر گلیڈ اسٹون پورے طور پر واقف تھے اور جنہوں نے مولوی مہدی علی سے اکثر اس امر کا اعادہ کیا کہ برطانوی حکومت ہندوستان کے لئے ایک نعمت و رحمت ہے اور اسی وجہ سے اُنہوں نے تیس سال ہوئے غدر کے موقع پر انگریزوں کے ساتھ اپنی قسمت وابستہ کر دی تھی۔

مسٹر گلیڈ اسٹون نے جواب میں فرمایا کہ مجھے یہ حالات سُن کر مخصوص مسرت اور طمانیت حاصل ہوئی بالخصوص اس وجہ سے کہ آپ نے براہ راست یہ روایت ایسے شخص سے سُنی جو معتبر اور بارسوخ ہے۔

اس کے بعد گفتگو کا رُخ اس اعانت اور امداد کی طرف پھرا جو گزشتہ سالوں میں دیسی والیانِ ریاست نے حکومت برطانیہ کو پیش کی تھی۔ جن میں سب سے گراں قدر امداد ہز ہائی نس نظام حیدرآباد کی طرف سے پیش کی گئی تھی، اور حیدرآباد وہ ریاست ہے جہاں سے ہر دو قبیع اسلامی جذبہ کی شعاعیں ہندوستان کے ہر گوشہ میں پھیلتی رہتی ہیں۔ اس سلسلہ میں ریاست کے امیر کبیر سر آسماں جاہ صدر اعظم کا بھی تذکرہ آیا جنہوں نے اپنے آقا کے نقش قدم کو اپنا رہنما بنایا اور یہ تہیہ کر لیا تھا کہ اگر موقعہ آیا تو اپنے سارے ذرائع اور وسائل حکومت برطانیہ کے لئے محفوظ اور مخصوص کر دینگے۔

مسٹر گلیڈ اسٹون نے جواب دیا کہ جو جذبات اس اقدام کے محرک ہوئے ہیں وہ نہایت درجہ قابل ستائش ہیں اور یہ امر کہ اس کا انتظام بھی ہو گیا ایک ایسا حیرت انگیز واقعہ تھا جو اب تک اُن کے علم میں نہ آیا تھا اور اُن کو یقین تھا کہ تاج برطانیہ کے

ساتھ یہ دلی عقیدت کبھی زائل یا زوال پذیر نہ ہوگی۔

نیشنل کانگریس کے مسئلہ پر مسٹر گلیڈاسٹون نے فرمایا کہ مجھے کافی معلومات نہیں ہیں اس لئے مجھے اس موضوع پر بحث کرنے میں پس و پیش ہے لیکن جہاں تک میرا علم ہے، کانگریس کے سامنے جو مسائل ہیں وہ بالعموم شادی کی اصلاح یا صغر سنی کی شادی کے انسداد سے متعلق ہیں اور یہ وہ مسائل ہیں جو کلیتاً ہندوؤں سے متعلق ہیں۔

مولوی مہدی علی نے کہا کہ اُن کے ہم مذہب بحیثیت قوم اُسمیں شامل نہیں ہوئے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ حکومت کو اصلاحات کو نافذ کرنے کے لئے آزاد چھوڑ دیا جائے کیونکہ اُس نے اُن کے اور اُن کے مذہب کے لئے بہت کچھ کیا تھا اور اُس کے خلاف سیاسی شورشیں کرنا نا روا تھا۔ اُس کے ساتھ اُنہوں نے یہ بھی فرمایا کہ اس میں شک نہیں تعلیم یافتہ باشندگان وطن کا حکومت کے معاملات میں رائے زنی کے لئے آمادہ ہونا یقیناً بہتر ہے لیکن دوسری طرف اس میں یہ خطرہ ہے کہ باشندوں کی کثیر تعداد غیر تعلیم یافتہ ہے اور انتظامی معاملات پر غور و فکر کرنے کی اہل نہیں ممکن ہے حکومت کے رویہ پر باشندگان کی نکتہ چینی حکومت کی ناقابلیت اور کمزوری پر محمول کی جائے اور اس غلط فہمی کا پھیلنا نہایت درجہ ناپسندیدہ بات ہے۔

مسٹر گلیڈاسٹون نے جواب دیا کہ ممکن ہے ایسا ہی ہو لیکن وہ یہ چاہتے نہیں کہ لوگ یہ سمجھیں کہ اُنہوں نے اس مسئلہ پر اظہار خیال کیا ہے۔ البتہ وہ اس امر کا اعادہ کر سکتے ہیں کہ وہ ہر اُس تجویز یا تحریک کا نہایت گرمجوشی کے ساتھ خیر مقدم کرنے کے لئے تیار ہیں جو جائز اور معقول ہو۔ اور جس کا بروئے کار لانا لوگوں کے نزدیک ان کی ضروریات کی کفیل اور صورت حال کی مصلح ہو۔

اس کے بعد مسٹر گلیڈاسٹون اُن لوگوں کو قدیم الایام قصر کے منہدم آثار پر لے گئے اور اُس کی تاریخ اور قدامت کی تفصیل بیان کرتے رہے۔ اُنہوں نے اپنے پارک کی

خوش نمائیوں کی طرف لوگوں کو متوجہ کیا مزید گفتگو کے سلسلہ میں اُنھوں نے فرمایا کہ مجھے یہ امر معلوم کرکے نہایت مسرت ہوئی کہ ہز ہائی نس نظام نے اپنے خاندان کی روایات کو نظر انداز کرکے اپنے دادی صاحبہ مکرمہ کے جنازہ میں شرکت کی۔ اُن کو یہ معلوم کرکے بھی طمانیت ہوئی کہ موجودہ دور میں مسلمان ذہنی ترقی حاصل کر رہے ہیں جس کی ایک علامت یہ ہے کہ اس وقت آکسفورڈ اور کیمبرج کی یونیورسٹیوں میں تقریباً ۳۰ ہندی مسلمان داخل ہیں۔

مسٹر گلیڈ اسٹون کے لئے یہ امر موجب دلچسپی ہوا کہ مولوی مہدی علی اس امر سے واقف تھے کہ ان کو (مسٹر گلیڈ اسٹون کو) درختوں سے محبت ہی اور تبر آزمائی میں اُن کی طاقت مسلم تھی۔ مسٹر گلیڈ اسٹون نے اپنا ایک فوٹو دیا جو اس وقت لیا گیا تھا جب کہ وہ درخت کاٹ رہے تھے۔ اُس کے معاوضہ میں اُنھوں نے نواب مہدی علی کا فوٹو لینا بھی منظور کیا۔

اس کے بعد مسٹر گلیڈ اسٹون نے نواب مہدی علی کا تعارف اپنے خاندان کے دوسرے اراکین سے جو اس وقت قصر ہاورڈن میں موجود تھے کرایا۔ اس ملاقات کے اختتام پر جو شروع سے آخر تک نہایت خوشگوار اور پُر خلوص تھی، مسٹر گلیڈ اسٹون نے نواب مہدی علی سے فرمائش کی کہ وہ اُن کا مودبانہ سلام اور اُن کی بہترین تمناؤں کا ہدیہ ہز ہائی نس نظام کی خدمت میں لے جائیں۔ اور ایک مرتبہ پھر اس کا اعادہ کیا کہ ہز ہائی نس نے جس فیاضی کے ساتھ حکومت برطانیہ کی اعانت پر آمادگی ظاہر کی تھی اسکو وہ کبھی فراموش نہ کرسکیں گے۔

واپسی میں ایک دعوت

جب وہ لندن سے واپس ہونے لگے تو ہز گریس ڈیوک آف ایسٹ منسٹر (؟) کا دعوت نامہ موصول ہوا جس میں نواب مہدی علی کو خاص طور پر مدعو کیا تھا۔ چنانچہ اٹین ہال میں نہایت توقیر و احترام کیساتھ نواب صاحب کے مراسم پذیرائی بجا لائے گئے۔

اور اس رفیع الشان قصر کے تمام حصّوں، عالی شان بیرونی عمارتوں، باغ اور رمنے کی سیر کرائی گئی۔ (ترجمہ لندن ٹائمز ۲۱ ستمبر ۱۸۸۸ء)

اس ملاقات کے متعلق متعدد اخبارات نے تبصرے کئے اور مضامین لکھے لیکن اس موقع پر لندن ٹائمز کا ہی تبصرہ درج کیا جاتا ہے۔

لندن ٹائمز کا تبصرہ

ہم آج حکومت نظام کی اطلاع کے لئے نواب مہدی علی (نمایندہ نظام بسلسلہ مقدمہ دکن) اور مسٹر گلیڈاسٹون کی ملاقات (بمقام ہاورڈن) کی کیفیت شائع کر رہے ہیں اور ہم کو یہ سن کر مسرت ہوئی کہ ملاقات آخر تک نہایت دوستانہ اور دلچسپ رہی اور دونوں اس ملاقات سے مسرور ہوئے۔

نواب مہدی علی، مسٹر گلیڈاسٹون کی شہرت ہندوستان اور انگلستان میں پہلے ہی سن چکے تھے اور اس زبردست مدبر کے متعلق اپنے حسنِ ظن میں قابلِ قدر اضافہ کرنے کا تہیّہ کر کے آئے تھے۔

ہمیں امید ہے کہ جب وہ نظام کے حضور میں واپس جائیں گے تو اس عزت و توقیر کا یقین لے کر جائیں گے جو اس مشرقی حکمراں کی مسٹر گلیڈاسٹون کے دل میں ہے خصوصاً وہ گرم جوشی اور ہمدردی جو موصوف نے ان تمام لوگوں کی نسبت ظاہر کی جن کا تذکرہ اس ملاقات میں آیا، لیکن اگر (نواب) مہدی علی مسٹر گلیڈاسٹون کے سیاسی نظریات کی ٹوہ میں ہاورڈن آئے تھے تو ہمیں یقین ہے کہ وہ اپنی معلومات میں کسی قسم کا اضافہ کر کے نہ لے گئے ہوں گے۔

(نواب) مہدی علی نے دو باتوں پر بہت زور دیا اور چاہا کہ اُن کا معزز میزبان دل کا گہرا راز کہہ دے لیکن انہیں اُن میں سے ایک کا بھی تسلی بخش جواب نہیں ملا جتنا وہ چاہتے تھے۔

جنگ کریمیا کی پالیسی اور دولت انگلشیہ کا اُسے برقرار رکھنا، نیز بر وقت ضرورت

ٹرکی کو مسلح فوج سے امداد دینے کے متعلق مسٹر گلیڈ اسٹون نے صرف اتنا کہا کہ یہ سوال بہت اہم ہے اور اس میں کافی بحث کی گنجائش ہے، ذاتی طور پر مسٹر گلیڈ اسٹون کے خیالات ٹرکی کی طرف سے بہت اچھے ہیں لیکن ہمیں علم نہیں کہ اُن کو عملی جامہ پہنانے کے لئے وہ کہاں تک تیار ہیں۔

اسکندریہ کی گولہ باری ایک ایسی مثال تھی جو اس دوستی کے ثبوت میں پیش کی جاسکتی تھی لیکن چونکہ اس کا اثر ترکی کے بیرونی علاقہ پر پڑا اس لئے یہ کافی تسلی بخش ثابت نہیں ہوئی، مگر مسٹر گلیڈ اسٹون کے کاموں کو اگر ہم اُن کی تہ تک پہنچنا چاہتے ہیں تو اُن کے الفاظ کی طرح گہری نظروں سے دیکھنا چاہیئے، یہ ہمیں اب معلوم ہوا کہ گولہ باری کی غرض صرف اتنی تھی کہ مصر میں ترکی حکومت کا دخل ہو جائے مگر بدقسمتی سے سلطان ترکی نے اس کی غلط توجیح کی اور اس موقع سے فائدہ نہیں اُٹھایا جو اُن کے ناخواندہ مددگار روسے نے بہم پہنچا دیا تھا۔

مسئلہ مصر کے متعلق مسٹر گلیڈ اسٹون کو ذرا بھی شک نہیں کہ حکومت اِس بات پر تیار ہے کہ مصر سے دست بردار ہو جائے اور وہ اپنی فوج ضروری مدّت سے زیادہ ہرگز نہیں رکھے گی۔

یہ ایک عام طرز بیان ہے ورنہ جب کہ وقت کی میعاد مقرر نہیں کی گئی ہے اور نہ کوئی ایسی شرط پیش کی گئی ہے جس سے معلوم ہو سکے کہ کب مصر میں فوج کی ضرورت باقی نہیں رہے گی تو اس کا مطلب خبط ہو جاتا ہے۔

اِسی طرح (نواب) مہدی علی انڈین نیشنل کانگرس سے متعلق بھی مسٹر گلیڈ اسٹون کے خیالات معلوم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے، اِس میں بہت سی دشواریاں تھیں۔

(نواب) مہدی علی انگلستان میں ایک مسلمان حکومت کے نمایندے کی حیثیت سے آئے تھے اور مسلمانان ہند نے اپنے کو بحیثیت قوم کانگریس تحریکوں سے بالکل علیحدہ رکھا ہے۔

اُس سے (مسٹر گلیڈاسٹون کے) اتفاق کرنے کے یہ معنی ہوتے کہ اس میں حصّہ نہ لینے والے قابلِ الزام ہیں اور اس تحریک کے خلاف رائے دینا گویا اپنی اُس پوزیشن کو مجروح کرنا تھا جو مسٹر گلیڈاسٹون کو انقلابیوں میں حاصل ہے خواہ وہ دنیا کے کسی حصّہ میں کیوں نہوں لیکن (نواب) مہدی علی اب بھی کچھ کچھ زور دیے رہے تھے اُنہوں نے مسٹر گلیڈاسٹون کی توجہ کانگریس سے پیدا ہونے والے خطرات کی طرف مبذول کرائی اور اپنے ہندوستانی ہم مذہبوں کے دوسری راہ اختیار کرنے کی بھی معقول وجوہ بیان کیے مگر مسٹر گلیڈاسٹون اِس قالب میں نہ ڈھل سکے اور اُنہوں نے عمومیت کے دامن میں پناہ لی، وہ اس مخصوص معاملہ پر اظہار خیال کرنا نہیں چاہتے تھے اور ہر طرح اپنا پہلو بچا رہے تھے، اُنہوں نے جو کچھ کہا وہ صرف یہ تھا کہ انہیں ان لوگوں سے کافی ہمدردی ہے جو اپنے مطالبات پورے کرانے اور اپنی حالت سدھارنے کی جائز اور معقول کوششوں میں لگے ہوئے ہیں لیکن جو مسائل اسوقت درپیش ہیں ایسے ہیں جن کی نہ تو حمایت ہی کی جا سکتی ہے اور نہ مخالفت،

جانبین کے لئے ایک سب سے بڑی مشکل مسٹر گلیڈاسٹون کی معلومات کا ناقص ہونا ہے جو ایک اہم مسئلہ میں سدِّراہ ہے ہم کو اس مسئلہ پر اس سے زیادہ غور نہیں کرنا چاہیے کہ اُن کے لیے یہ ایک خوشگوار حیلہ تھا کیوں کہ مسٹر گلیڈاسٹون کے ذرائع معلومات بہت زیادہ وسیع ہیں اور اُن کی یہ عادت ہے کہ معمولی سے معمولی معاملات بھی جو کہ نظر انداز کیے جا سکتے ہیں وہ اُن کی حقیقت بھی معلوم کر لینا چاہتے ہیں۔ لیکن چوں کہ اُن کے حیلہ کی بنیاد پختہ تھی اس لئے اُن کے عذر میں شبہ کی گنجائش نہیں۔

کانگریس کے متعلق مسٹر گلیڈاسٹون کو جو کچھ یاد ہے وہ صرف ہندوستان کا قانون شادی ہے اور بچپن کی شادی کا انسداد (خصوصاً اہلِ ہنود میں جیسا کہ اُنہوں نے ظاہر کیا) مسٹر گلیڈاسٹون اس بات سے خوش ہیں کہ انہیں کچھ باتیں یاد ہیں اور کچھ سے

بھلا دینے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

اگر کانگریس کا نصب العین صرف اہلِ ہنود میں شادیوں کی اصلاح کرنا ہی ہے تو (نواب) مہدی علی کے ہم مذہب مسلمان کانگریس سے علیحدہ رہنے میں حق بجانب ہیں کیونکہ انہیں قانونِ شادی سے کوئی سروکار نہیں۔

لیکن جب (نواب) مہدی علی نے یہ دریافت کیا کہ کیا غیر تعلیم یافتہ طبقہ حکومت کا بہترین نقاد ہو سکتا ہے اور کیا اُسے اس کی شہ دینا خطرناک نہیں تو مسٹر گلیڈ اسٹون کے حافظہ کی کمزوری نے اُن کی بہترین خدمت کی۔

ہم نہیں سمجھتے کہ (نواب) مہدی علی کے یہ سوالات کسی طرح بھی اُس زبردست مدبّر کی ذہانت کو مشتبہ کر سکتے ہیں لیکن پھر بھی مسٹر گلیڈ اسٹون نے انہیں بہت ہی کھٹکے دل سے سُنا ہوگا اور اپنے دل میں یہ سوچ کر خوش ہوئے ہونگے کہ میں نے اپنی لاعلمی کا اظہار کر دیا، اور یہی وہ آلہ ہے جس سے وہ اس وقت کام لیتے ہیں جب صاف جواب دینا نہیں چاہتے، مسٹر گلیڈ اسٹون اپنی اُس محبت پر جو انہیں ہندوستان اور خاص کر وہاں کے مسلمانوں سے ہے بغیر کسی قسم کی احتیاط کے اظہار خیال کر سکتے تھے وہ یہ سوچ سوچ کر خوش ہو رہے تھے کہ تمام لوگ اور تمام سیاسی جماعتیں اُن کی ہم خیال بنتی جا رہی ہیں اور ایک مفید اور ایک روشن پالیسی ہندوستان کے لئے تیار ہے لیکن جب اُنہوں نے اپنے جذبات کی گرم جوشی کا ثبوت دیا جو انہیں ہندوستان اور وہاں کے مسلمانوں کے ساتھ ہے تو وہ ایسا ہی تھا جیسا کہ ترکی سے ہمدردی رکھنے کا ثبوت تھا۔

ترکی سے محبت کا ثبوت اُنہوں نے اسکندریہ پر گولہ باری کر کے دیا تھا اور ہندوستانی مسلمانوں کے ساتھ اپنی محبت کا اظہار اُنہوں نے لارڈ رپن کو ویسرائے بنا کر کیا جنہوں نے ایک ایسی پالیسی اختیار کی جس سے ہندوستانی مسلمانوں کو اظہار بیزاری کرنے کا ہر طرح حق حاصل تھا۔ مثلاً انہیں اس حق سے محروم رکھنا جو اُن کو پبلک کے معاملات اور

نظامِ حکومت میں حاصل ہے ۔

ہمیں معلوم ہے کہ مسٹر گلیڈ اسٹون کو ہر شے سے ایک خاص ہمدردی ہے حتےٰ کہ درختوں سے بھی، لیکن یہ ہمدردی جیسا کہ اُنھوں نے اپنے مہمان کو بتا یا اُن کی ہمت وشجاعت کو کلہاڑی استعمال کرنے سے باز نہیں رکھ سکتی ۔

(نواب) مہدی علی ہندوستان اپنے ساتھ ایک تصویر لے جائیں گے جو اس وقت لی گئی ہے جب کہ مسٹر گلیڈ اسٹون ایک درخت کے کاٹنے میں مشغول تھے ، یہ تصویر سیاحت ہاورڈن کی ایک دلچسپ یادگار ثابت ہوگی اور اکثر اُن کے دل میں اس درشتی کی یاد تازہ کرتی رہا کرے گی جس سے وہ کبھی کبھی اپنی عالمگیر محبت کے ساتھ پیش آیا کرتے ہیں

اسوقت مسٹر گلیڈ اسٹون آئرلینڈ کی حکومت کی تنظیم میں اس درجہ منہمک ہیں کہ اُنہیں دوسرے معاملات پر توجہ کرنے کا بالکل وقت نہیں ملتا ہے (یوں تو) ان کا دریائے ہمدردی ہر اُس نشیب میں بہنے لگتا ہے جو اپنے کو پیش کردے لیکن یہ صرف آئرلینڈ ہی ہے جس پر اُن کی ساری فراست ختم ہوئی جارہی ہے ۔ وہ ہندوستان کے اندرونی معاملات کو اپنے سے چھوٹوں کے لئے چھوڑ دینے پر بالکل آمادہ ہیں لیکن ایک تماشائی کی حیثیت سے وہ معاملات کی تغیرِ حال پر خوش ہیں ۔

نظام اور دوسرے رئیسوں کی اس بات پر آمادگی کہ وہ اپنے سارے ذرائع اور وسائل حکومت کو حوالہ کر دینے پر تیار ہیں مسٹر گلیڈ اسٹون کے لئے باعث صد مسرت و انبساط ہے لیکن اس بات پر وہ بالکل خاموش ہیں کہ اُن کی ضرورت کہاں پیش آئے گی وہ اس پیش کش کو قابلِ ستائش مستعدی سے تعبیر کرتے ہیں اور اُسے اپنے دورِ حکومت کا سب سے بڑا کارنامہ سمجھتے ہیں ۔

ممکن ہے کہ یہ بیان کچھ مبالغہ آمیز معلوم ہو لیکن مسٹر گلیڈ اسٹون خود دورانِ ملاقات میں مبالغہ کی بلندیوں پر موجود تھے ، وہ جس طرف مائل ہوتے تھے اُن کے جذبات

اس درجہ شدید ہوتے تھے کہ اُن کو الفاظ کا جامہ پہنانا ہی پڑتا تھا اگر نظام کا برطانوی حکومت کے ساتھ اطاعت و فرماں برداری کا رویہ رکھنا انتہائی خوشی و مسرت کا سبب ہے تو اسی طریقہ سے اُس فرماں روا کے لئے انتہائی سعادت مندی کے ساتھ اپنی دادی صاحبہ کے جنازہ میں شرکت ایک اخلاقی فرض تھا۔

"ہر چیز ایک خوش نما رنگ میں رنگی ہوئی تھی جس کو ایک زبردست دماغ کا پرتو تصور کرنا چاہیئے۔"

اگر (نواب) مہدی علی اس ملاقات میں جن معاملات کے متعلق معلومات بہم پہنچانا چاہتے تھے کچھ زیادہ بہم نہ پہنچا سکے تو وہ اپنے دل پر مسٹر گلیڈاسٹون کی شخصیت کا ایک خوشگوار اثر ضرور لے کر رخصت ہوئے ہوں گے۔

اس کے علاوہ ہمارا خیال ہے کہ وہ مسٹر گلیڈاسٹون کی اس تدبّر و فراست کا بھی زبردست نقش لے کر گئے ہوں گے کہ انہوں نے کہیں کوئی بات ایسی نہیں کہی کہ جس سے اُن کی کہیں کسی طرح کی گرفت ہو سکے اور وہ نازک و دقیق مسائل کے پیچ و خم سے پورے طور پر نکل آئے

نواب محسن الملک اور مسٹر گلیڈاسٹون کی مراسلت

نواب صاحب اس ملاقات میں مسٹر گلیڈاسٹون کے افکار و خیالات معلوم کرنے میں پورے کامیاب نہ ہو سکے اس لئے انہوں نے واپس آکر کانگریس کے متعلق ایک خط لکھا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ :-

خلاصۂ خط

گزشتہ ستمبر کو جب کہ ہاورڈن میں آپ نے مجھے شرف ملاقات بخشا تھا اسوقت نیشنل کانگریس کے متعلق جس کی جانب سارے ہندوستان کی توجہ روز بروز بڑھ رہی ہے اظہار خیال کے لئے میں نے آپ سے درخواست کرنے کی جرأت کی تھی۔ ہندوستان کے بعض مشہور و معروف اخباروں نے سر آکلینڈ کالون

صاحب کی رائے سے اتفاق کیا ہے اور چند نے اختلاف۔ سر سید احمد خاں اور دوسرے حضرات جنہیں ہم اپنا رہبر سمجھتے ہیں اُنہوں نے بھی اس بارہ میں اپنی رائے بہ تفصیل ظاہر کی ہے ایسی حالت میں (بشرطیکہ معاملات ملکی اس قسم کے اظہار خیال میں حائل نہ ہوں) اگر آپ اس سلسلہ میں اپنے گراں بہا خیالات کا اظہار فرمائیں تو آپ کے علو مرتبت کی وجہ سے دنیا پر اس کا دائمی اور پائندار اثر ہوگا۔

ہم کانگریس کے خلاف نہیں خصوصاً ہم اس طرز و طریق کو اور بھی برا سمجھتے ہیں جن کے ذریعہ سے اس کے حامیوں نے کانگریس کو مقبول بنانے کی سعی کی ہے لیکن یہ مسئلہ اس قدر پیچیدہ ہے کہ ہم اسے کماحقہٗ حل نہیں کر سکتے نہ ہماری تعلیم اس درجہ کو پہنچی ہے کہ ہم ملک کے لیے تعمیری معاملات پر بخوبی غور کر سکیں علاوہ ازیں کوئی تاریخی مثال بھی نظر نہیں آتی کہ ایک ایسی مرکزی قانون ساز جماعت موجود ہو جو قوم اور مذہب کے لحاظ سے مختلف فریقوں پر مشتمل ہو۔ مقامی فساد کے تازہ اور گوناگوں اسباب یا گورنمنٹ پر اعتراضات اور نکتہ چینی کی بھرمار ممکن ہے کہ یہ چیزیں مجوزہ کانگریس کی توجہ کو اپنی جانب منعطف کر لیں لیکن اس سے کسی مفید قانون سازی کی توقع نہیں پائی جاتی۔

اِس خط کا جواب حسب ذیل تھا۔

مسٹر گلیڈ اسٹون کا جواب

ہاورڈن کاسل۔ چیسٹر ۱۰ دسمبر ۱۸۸۸ء

ڈیر سر۔ آپ کے دلچسپ خط کا تفصیلی جواب ہندوستان سے متعلق بعض ایسے مسائل کی تفصیل و تجزیہ کا محرک ہوتا ہے جن سے عہدہ برآ ہونا میری طاقت سے باہر ہے۔ انسانی نسل کی تاریخ میں نیابتی نظام کار کا زمانہ ماضی میں بہت بڑا حصہ رہا ہے اور آئندہ ممکن ہے اس کی کارفرمائی اور بھی زیادہ مسلّم اور متیقن ہو، اس کی ابتدا آریائی بالخصوص مغربی ہے اور میرا خیال ہے کہ یہ عیسائی

کلیسا کے داخلی نظام کار کا رہین منت ہے، اس سے صلاح و فلاح کے مہتم بالشان ثمرات حاصل ہوئے ہیں اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اس طریقہ کار کو مزید توسیع دی جائے۔

مجھے نہیں معلوم کہ مسلمانوں کا عیسائی مبلغاریوں کے ساتھ اتحاد یک بہ یک اور یک لخت ان ممالک میں بھی ممکن و مقبول ہوگا جہاں اس قسم کے اتحاد کا برسرکار لانا غرابت سے خالی نہیں اس لئے ان کا نتیجہ خیز یا ثمرآفریں ہونا بھی غیر متیقن ہے۔

ایسے معاملات میں کامل غور و خوض کرنا چاہیئے اور ایسی مساعی برسرکار لانے چاہئیں جن سے تجربہ حاصل کرنا مقصود ہو۔

میں اس مسئلہ کو اسی طور پر چھوڑتا ہوں لیکن میں یہ ہرگز پسند نہیں کروں گا کہ اس مسئلہ میں مختلف آرا و افکار کو دبانے کی کوشش کی جائے بشرطیکہ اس کا اظہار خیرخواہانہ اور سنجیدہ طریقہ پر کیا جائے۔

آپ کا مخلص و عقیدت مند

ڈبلیو، ای۔ گلیڈاسٹون

قوم میں حیات اجتماعی اور احساس ملّی پیدا کرنے کی کوشش

سرسید نے اپنی قوم کے ارتقا کی جو کوششیں شروع کی تھیں اُن میں تعلیمی کانفرنس کا قیام بھی ایک مؤثر اور زبردست کوشش تھی یہ کانفرنس ۱۸۸۶ء میں قائم ہوئی تھی اور یقین تھا کہ اس کے ذریعہ قوم میں حیات اجتماعی اور اپنی حالت پر غور کرنے کا ایک جذبہ پیدا ہوگا لیکن سات برس تک اُن کو جب کہ وہ عمر کی سترویں منزل میں تھے تنہا یہ مہم سر انجام کرنی پڑی۔ ایم، اے او، کالج کے کام بھی کچھ کم نہ تھے اور یہ سب بار ان ہی کی ذات پر تھا اس لئے کانفرنس کا دائرہ اثر محدود رہا۔ نواب محسن الملک اس عرصہ میں اگرچہ حیدرآباد میں تھے لیکن رفتار حالات پر ان کی نظر تھی وہ جو کچھ برٹش انڈیا میں ہو رہا تھا اس کو غور و خوض کے

ساتھ دیکھتے تھے ۱۸۹۳ء میں جب سبکدوش ہوکر آئے تو اُنھوں نے اسی کانفرنس کو قوم میں حیات اجتماعی اور احساس ملی پیدا کرنے کا آلہ بنایا۔ وہ اُس کو ایک قومی مرکز بنانے پر متوجہ ہوئے پہلے اُنھوں نے ۱۸۹۳ء کے اجلاس میں اپنی تقریروں سے جذبات کو اُبھارا اپنی اعجاز بیانی سے طبیعتوں میں ولولہ اور دلوں میں جوش پیدا کیا، اُنھوں نے ایک رزولیوشن پر بحث کرتے ہوئے کانگریس کی مثال اِس طرح پیش کی کہ "ذرا آنکھ کھولکر ایک نیشنل کانگریس کی کارروائی کو دیکھیئے اور اس کے نتیجوں پر خیال فرمائیے کیا وہ جوش جو ہمارے ہم وطن دکھلا رہے ہیں اور جس استقلال اور گرم جوشی سے وہ کام کر رہے ہیں اور جو اخلاص اور اتحاد باہم ان کے ہے اور وہ ہمدردی جو قلم سے زبان سے مال سے جان سے وہ ظاہر کر رہے ہیں اس قابل ہیں کہ آپ اسے عبرت کی نظر سے نہ دیکھیں اور آپ کی حمیت وغیرت کا خون جوش نہ کرے اور اپنی قوم کے لئے ان کے مقابلہ میں کچھ نہ کریں۔ بھائیو، یہ نتیجہ کس چیز کا ہے صرف اعلیٰ تعلیم کا، وہ تعلیم کی کی بدولت اِس قابل ہوگئے کہ اپنی اغراض پبلک کے سامنے پیش کر سکتے ہیں وہ اپنا استحقاق گورنمنٹ پر ثابت کر سکتے ہیں وہ اس چیز کے پانے کے لیاقت رکھنے کے مدعی ہیں جس چیز کو وہ مانگتے ہیں اور باوجود اس بات کے کہ ان کی کوششیں کچھ ناجائز ہیں اور کچھ ناواجب اور کچھ پیش از وقت اور باوجود اس بات کے کہ ان کی کچھ کارروائیاں حیرت انگیز ہیں اور باوجود اس بات کے کہ بہت زبردست مزاحمت اُن کے سامنے ہے مگر وہ صرف اعلیٰ تعلیم میں لیاقت پیدا کرنے اور انگریزی میں پوری مہارت رکھنے اور فصاحت وبلاغت سے تقریر کرنے اور زبردست تحریروں سے اپنے مطلب کے حاصل کرنے میں کامیاب ہوتے چلے جاتے ہیں اور ایک حیرت انگیز رسوخ اور وقعت انگلستان کی پبلک کے دلوں میں پیدا کر رہے ہیں اور بتدریج پارلیمنٹ کے ممبروں کی توجہ بلکہ ہمدردی حاصل کر رہے ہیں۔

گیا پارلیمنٹ میں ۱۸۹۳ء سیمل ٹینیس اگزامی نیشن (علیحدہ علیحدہ امتحانات) ولایت اور ہند دونوں جگہ ایک وقت مقابلہ کے امتحان حاصل کرنا اور گیا گورنر جنرل کی کونسل میں انتخاب کا قاعدہ جاری ہونا ایسے دو بڑے واقعے نہیں ہیں جن کو عبرت کی نظر سے مسلمان دیکھیں اور جس پر اپنی افسوسناک حالت پر توجہ نہ کریں۔

انہوں نے اسی تقریر میں اکتوبر ۱۸۹۳ء کی سول لسٹوں سے اعداد و شمار جمع کر کے یہ بات بھی دکھائی کہ تعلیمی پس ماندگی و غفلت ہی کا یہ سبب ہے کہ مسلمان سرکاری ملازمتوں میں بھی بمقابلہ ۱۸۸۶ء کے ایک درجہ تنزل کر گئے ہیں۔

اسی طرح وہ ہر اجلاس میں جوش و گرمی پیدا کرتے رہے اور ساتھ ہی اس کی تنظیم جدید پر توجہ رہی۔

۱۸۹۹ء میں جب قومی رہبری کا بار اُن کے شانوں پر رکھا گیا تو انہوں نے کانفرنس کی ایک مرکزی حیثیت قائم کر دی صوبہ متحدہ کے علاوہ پنجاب و بمبئی، کلکتہ اور مدراس تک کے تمام مسلمانوں کو ایک مرکز پر جمع کر دیا اور جسد قومی میں حیات اجتماعی اور احساس ملّی کی روح پھونک دی۔

محافظت حقوق اور احتجاج کا پہلا معرکہ

۱۹۰۰ء میں اُردو ہندی کے متعلق جو احتجاج کیا وہ دراصل ایک امتحانی قدم تھا اور اگرچہ اس میں حسب مُراد کامیابی نہیں ہوئی لیکن قوم کو اپنی طاقت کا اندازہ اور طاقت میں اضافہ کرنے کا خیال پیدا ہو گیا اور ان کے سیاسی جمود میں حرکت شروع ہو گئی۔

سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کے حقوق کا مسئلہ

بظاہر نوکری غلامی کے مرادف ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان میں ملازمت کا پیشہ بہت کچھ

---

[۱] پہلے امتحانات مقابلہ صرف انگلستان میں ہوتے تھے اور یہ ہندوستانیوں کے لئے ایک روک تھی۔

وزنی اور وقیع ہے اسی پر پولیٹیکل وقعت کا انحصار اور سیاسی اثر کا قیام ہے۔ نیشنل کانگریس کی ابتدائی سرگرمیوں میں بھی یہی مطمح نظر موجود ہے اور یہی اہم مطالبہ رہا ہے لیکن حکومت کی پالیسی اور جدید تعلیم کی شرط لازم نے مسلمانوں پر بہت بُرا اثر ڈالا، اس شعبۂ زندگی کے دروازے اُن پر مسدود ہو گئے اور ایک صدی کے اندر ان کی تعداد ۵۰ فی صدی سے تنزل کر کے ایک اور دو فی صدی کے درمیان رہ گئی۔

اگرچہ مسلمان تعلیم میں پس ماندہ تھے تاہم وہ نسبتاً ترقی کر رہے تھے اور اب اُن کا حق تھا کہ ملازمتوں میں اُن کو اسی نسبت سے حصّہ ملے، بعض صوبوں کی گورنمنٹوں نے بھی تلافی حق کے متعلق احکام جاری کئے لیکن دروازہ پر دو سروں کا پہرہ تھا، صوبہ متحدہ میں جب سرانٹونی میکڈانل کی گورنمنٹ نے مسلمانوں کے ساتھ عدم رواداری بلکہ ناانصافی کی تو اس موقع پر نواب محسن الملک نے انسٹیٹیوٹ گزٹ میں اس مسئلہ پر بحث شروع کر کے مسلمانوں کو حق طلبی کے لئے آمادہ کیا۔

مسلمانوں کے پولیٹکل حقوق کی حفاظت

۱۹۰۶ء میں یہ سوال کہ ''مسلمانوں کو اپنے پولیٹکل حقوق کی حفاظت کے لئے کیا تدابیر اختیار کرنا چاہیئے''، موضوع بحث بنا کر اور متعدد مضامین لکھکر تعلیم یافتہ نوجوانوں کے سامنے سیاسی آزادی و آراء کا ایک باب کھول دیا جس کے نتیجہ میں پولیٹکل ارگنائزیشن کی تحریک ہوئی جس کی تاسیس و تکمیل کا بار اُن کے بڑے رفیق نواب وقار الملک نے اپنے شانوں پر لیا، نواب محسن الملک اور اُن کے رفقا اپنی قومیت ہندو قومیت میں فنا کر دینے کے قائل نہ تھے اور نہ اپنے قومی حقوق اکثریت کے رحم و کرم پر منحصر رکھنا چاہتے تھے جس کا لارڈ رپن کے زمانہ سے تلخ تجربہ ہو رہا تھا اُنہوں نے دیکھ لیا تھا کہ جب مسلمان کچھ آگے بڑھنے کے قابل ہوئے اور ملکی حقوق سے متمتع ہونے کی صلاحیت آئی تو ان کو پیچھے ڈھکیلنے کی کوشش کی گئی، ان حالات میں وہ تجدید و تعین حقوق

ملکی اتحاد اور حکومت کی وفاداری سے سیاسی ترقی کے معتقد تھے اور اسی عقیدہ کی بنا پر ان کو ایک علیٰحدہ سیاسی جماعت کی ضرورت محسوس ہوئی۔

ہندو مسلمانوں کی منافرت

لیکن مسلمانوں کی یہ سیاسی حرکت برادران وطن کو پسند و دل پذیر نہ ہوئی ایک عرصہ سے تعلیم جدید نے ان کے دلوں میں اسلامی عہد حکومت سے تنفر کے ساتھ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں سے بھی نفرت پیدا کر دی تھی جو مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتی رہتی تھی وہ سیاسی اختلاف آرا جن کے لئے مسلمان قدرتی طور پر مجبور تھے زیادہ وجہ اشتعال تھا۔

مہاراشٹر کے مشہور لیڈر بال گنگا دھر تلک کو جو خالص برہمنیت کے علم بردار تھے اسلامی عہد سے انتہائی نفرت تھی اور اُن کے قلم و زبان اور تحریکات نے جذبات منافرت کو بہت زیادہ بھڑکا دیا تھا ان ہی کی کوشش سے ۱۸۹۳ء میں "انجمن مخالفین ذبیحہ گاؤ" کی بنیاد پڑی نیشنل کانگریس کی ترقی کے ساتھ ہی ساتھ ایسے واقعات و خیالات رونما ہونے شروع ہوئے کہ ہندو مسلمانوں کے درمیان ہموطنی کے تعلقات محبت منقطع ہونے لگے اگرچہ یہ فسادات غیر تعلیم یافتہ اور جاہل آبادیوں میں ہوئے لیکن اُن کا کھلا ہوا مقصد یہ تھا کہ اگر حکومت پر نہیں تو مسلمانوں پر ہندو تسلّط ہو جائے، ۱۹۰۵ء میں تقسیم بنگال کے خلاف ہندوؤں میں سخت ایجی ٹیشن پھیلا اور اگرچہ یہ ایک صوبجاتی مسئلہ تھا لیکن کانگرس نے اپنے دائرہ میں لے لیا کیوں کہ اس سے ہندوؤں کو نقصان اور مسلمانوں کو ایک گونہ فائدہ تھا۔ اس تقسیم کے سلسلہ میں بھی خوفناک فسادات بھی ہوئے، اور اب ان دونوں قوموں کے درمیان ایک وسیع خلیج حائل تھی۔

مسلمانوں میں تعلیم اتنی ترقی کر چکی تھی کہ وہ ملک کی آئین ساز جماعتوں اور انتظامات بلدیہ میں شریک ہو کر برادران وطن کے ہم جلیس ہوں لیکن ایک ایسے ملک میں جو

فرقہ داری کا گہوارہ ہو جس میں جدا جدا تہذیب و تمدن کی قومیں آباد ہوں اور اُن میں باہمی منافرت و سیاسی اختلاف اور عدم اعتماد موجود ہو جب تک کہ حقوق کی تجدید و تعین نہ ہو جائے اقلیت کبھی اکثریت کا مقابلہ نہیں کر سکتی، یہی وجوہ تھے کہ لارڈ رپن کی اصلاحات کے زمانہ سے اب تک مسلمان ہر اس شعبۂ زندگی میں جس کا تعلق حکومت اور پبلک سے تھا پیچھے تھے اور اسی لئے ان کو اپنے تحفظ حقوق کے لئے سیاسی تنظیم کی ضرورت ہوئی۔

منٹو مارلے ریفارم اسکیم اور مسلم مطالبات

ہنوز پولیٹیکل آرگنائزیشن کی تکمیل نہ ہوئی تھی کہ ۱۹۰۶ء کے آغاز میں وزیر ہند نے اپنی بجیٹ اسپیچ میں ہندوستانی مجالس مقننہ اور دیگر اصلاحات کا تذکرہ کیا۔

اس تقریر سے عامۃً مسلمانوں میں اپنے سیاسی حقوق کی طرف توجہ ہوئی جولائی ۱ ھ میں حاجی محمد اسمٰعیل خاں صاحب رئیس دتاولی وممبر لیجسلیٹو کونسل صوبہ متحدہ نے نواب صاحب کو ایک خط کے ذریعہ توجہ دلائی کہ "اس موقع پر مسلمانوں کو اپنی مرضی کے مطابق اپنے قائم مقاموں کو منتخب کرنے کے متعلق کوشش کرنی چاہیئے" اسی طرح دوسرے مقامات سے بھی خطوط وصول ہوئے جس میں اسی قسم کی تحریکات تھیں۔

نواب وقار الملک اور نواب محسن الملک میں تبادلۂ خیالات ہوا اور بالآخر علی گڑھ میں ایک کمیٹی منعقد ہوئی جس نے طے کیا کہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر حکومت کو مسلمانوں کے حقوق کی جانب توجہ دلائی جائے اور بہ اتفاق عام قرار پایا کہ نواب محسن الملک اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیں اور وائسرائے سے ڈپوٹیشن لانے اور ایڈریس پیش کرنے کی اجازت حاصل کریں تمام سربرآوردہ مسلمان مشاہیر اور اسلامی مجالس نے بھی اس قرارداد سے تحریری اتفاق کیا۔

۱ھ علی گڑھ تحریک کے بڑے حامی تھے ان کی خدمات بہت زبردست اور قابل شکریہ ہیں سالہا سال مسلسل مختلف صورتوں میں انہوں نے یہ خدمات کی ہیں انتقال ۱۹۱۵ء ۵۲ مکاتیب حصہ اوّل

ویسرائے کی خدمت میں ایڈریس اور ڈپوٹیشن پیش ہونے کی کوشش

مبادیاتِ امور طے ہو جانے کے بعد نواب محسن الملک نے ایک مفصل خط مسٹر آرچبولڈ پرنسپل ایم، اے، او کالج کو جو اُن دنوں شملہ پر تھے تحریر کیا کہ وہ ویسرائے کے پرائیویٹ سکریٹری سے اس کے متعلق گفت گو اور مشورہ[1] کریں۔ چنانچہ اُنہوں نے ایک وکیل کی حیثیت سے گفتگو کی اور ایک مختصر اطلاع کے بعد ۱۰ اگست کو مفصل خط بھیجا۔

مسٹر آرچبولڈ کا خط

میں اب پورے وثوق کے ساتھ آپ کو لکھ سکتا ہوں کہ مسلمانوں کا رویہ موجودہ صورت حال میں کیا ہونا چاہیئے جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں، میں نے کرنل ڈنلاپ اسمتھ کے سامنے پوری صورت حال پیش کر دی .... میں نے ان کو اس بات کا یقین دلا دیا ہے کہ میں کامل طور پر مطمئن ہوں کہ مجوزہ ڈپوٹیشن کا ایڈریس جو پیش ہوگا اس کے اندر کوئی بھی ایسی بات نہ ہوگی کہ جس میں عدم وفاداری کا شائبہ ہو اور مسلمانوں کی مطلق ایسی خواہش نہیں ہے کہ وہ کوئی بھی ایسا کام کریں جس سے گورنمنٹ کو وہ مشکلات میں ڈالیں اور ساتھ ہی میں نے مسلمانوں کے وہ تمام معقول اندیشے جو موجودہ حالت میں ہیں اپنی پوری قابلیت سے واضح کر دیئے ہیں۔

کرنل ڈنلاپ اسمتھ نے اب مجھ کو خط لکھا ہے کہ ہز اکسیلینسی ویسرائے نے فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ مسلمانوں کا ڈپوٹیشن قبول کر لیں گے اور اس کے لئے ایک ضابطہ کی درخواست بھیجنی چاہیئے نیز ایڈریس کی ایک کاپی ڈپوٹیشن پیش ہونے سے دس دن قبل اگر ممکن ہو تو بھیجدی جائے۔

درخواست منظوری

نواب صاحب نے ایک درخواست مرتب کی اور دستخطوں

---

[1] افسوس ہے کہ باوجود انتہائی کوشش کے اس کارروائی کی مراسلت حاصل نہ ہو سکی۔

کے لئے جداگانہ فارم طبع کرائے جن پر ہر صوبہ کے معزز تعلیم یافتہ اصحاب کے دستخط
حاصل کئے گئے ۱۶ر ستمبر کو درخواست روانہ کی گئی اور فارموں کی دو جلدیں جن پر
۱۱۸۳ دستخط ثبت تھے اس کے ساتھ بھیجی گئیں۔

درخواست پر حضور وائسرائے نے ڈپوٹیشن کی باریابی اور ایڈریس کا پیش
ہونا منظور کر لیا۔

ایڈریس و ڈپوٹیشن کی تیاری

اسی ضمن میں ہر صوبہ کے اہل الرائے اصحاب سے قومی حقوق
کے متعلق رائیں حاصل کیں اور ۲۴ اگست کو نواب عماد الملک
نے بمبئی آکر مسودہ مرتب کیا اور اُس کی نقول بھی غور کے لئے ارسال کی گئیں۔
۱۶ر ستمبر کو لکھنؤ میں ایک جلسہ ہوا جس میں ہر صوبہ کے قائم مقام شریک ہوئے
مسودہ بحث و تمحیص کے بعد آخری صورت میں مکمل ہوا۔

دو مہینے کی قلیل مدت میں اتنے عظیم الشان مرحلہ کا طے ہو جانا کہ تمام صوبجات
ہند کی انجمنوں اور اہل الرائے اصحاب ایک نقطۂ خیال پر مجتمع ہو جائیں اور مجوزہ
عرضداشت پر ہر صوبہ کے مختلف طبقات و خیالات کے پانچ ہزار لوگوں کے دستخط ہوں
نیز یہ کہ ساری کارروائی صیغۂ راز میں رہے۔ صرف نواب محسن الملک کی غیر معمولی
شخصیت قابلیت، محنت اور تنظیمی قوت کا نتیجہ تھا۔ تمام ہندوستان میں اسوقت جس قدر
با اثر و ممتاز اصحاب اور تعلیم یافتہ اہل الرائے تھے سب میں اتحاد خیال و اتفاق رائے
ہو گیا صرف مدراس کے ایک صاحب سید محمدؐ نے جو کانگریس کے نہایت سرگرم ممبر
تھے کچھ اختلاف کیا تھا۔

ڈپوٹیشن میں بھی ہر صوبہ کی نمائندگی رکھی گئی اور اس کی صدارت
کے لئے بالاتفاق ہز ہائی نس سر آغا خاں منتخب ہوئے۔

مطالبات | ایڈریس میں جن مطالبات پر خصوصیت سے زور دیا گیا تھا (بالاجمال) حسب ذیل تھے ۔

(۱) انتخابی اداروں میں جو طریقہ انتخاب رائج کیا جائے اس میں مسلمانوں کو مخصوص حلقہ ہائے انتخاب سے خود اپنے نمایندے منتخب کرنے کا حق ہو۔

(۲) قائم مقامی میں اُن کی اہمیّت اور سیاسی حیثیت کو ملحوظ رکھکر تناسب آبادی سے زیادہ نشستیں دی جائیں۔

(۳) مندرجہ گزٹ اور ذیلی ملازمتوں میں ایک مناسبت کے ساتھ مسلمانوں کا تقرر ہوا کرے ہائی کورٹوں اور چیف کورٹوں میں مسلمان جج اور ایگزیکیٹو کونسل میں مسلمان ممبر مقرر کئے جائیں۔

(۴) یونیورسٹیوں کی سنڈیکیٹ اور سینٹ میں بھی مسلمانوں کی تعداد مقرر ہو۔

(۵) محمدن یونیورسٹی کے قیام میں امداد کی جائے ۔

ان تمام مطالبات کو قوی دلائل اور واقعات واعداد کے ساتھ مرتب کیا گیا تھا اور انتخابی اداروں میں مسلمانوں کی جو حالت تھی اس کو تفصیل کے ساتھ دکھایا گیا تھا۔

ایڈریس کی پیشی اور جواب | یکم اکتوبر کو بڑی شان کے ساتھ ڈپوٹیشن حضور وائسرائے کی خدمت میں باریاب اور ایڈریس پیش ہوا۔ ہزاکسیلینسی لارڈ منٹو نے نہایت حوصلہ افزا جواب دیا اور اصولی امور کے ساتھ اتفاق کر کے آخر میں فرمایا کہ :-

"درسرد ست میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مسلمانانِ ہندوستان مطمئن رہ سکتے ہیں کہ جب تک میرا تعلق اس کشور کے انتظامی امور سے باقی ہے اُن کے قومی حقوق و مقاصد کا پورا لحاظ کیا جائے گا آپ اور تمام رعایائے ہندوستان پورا بھروسہ کر سکتے ہیں کہ جس طرح انگریزی راج کو

زمانہ گزشتہ میں تمام ان مختلف مذاہب و ملل اقوام کے ساتھ کہ جن سے ہندوستان کی بے شمار آبادی مرکب ہے مدارا و مراعات کی نظر رکھنے کا فخر حاصل رہا ہے اسی طرح ہمیشہ رہیگا۔"

شام کو وائسرائے کی طرف سے پارٹی تھی اور اس موقع پر ہز اکسیلینسی نے نواب محسن الملک کو یاد کر کے ڈیپوٹیشن کی کارروائی اور ایڈریس میں اعتدال پسندی کی تعریف کی۔

ایڈریس کی تعریف و تعریض ایڈریس کی کانگریسی اخبارات اور کانگریسی خیالات رکھنے والے اصحاب کے سوا ہندوستان و انگلستان میں تعریف کی گئی۔ لندن ٹائمس نے ایک زبردست ریویو کرتے ہوئے اس ایڈریس کی پیشی کو مسلمانوں کی بست سالہ پولیٹکل خاموشی کی مُہر سکوت ٹوٹنے سے تعبیر کیا بنگالی و کانگریسی اخبارات نے اس کو دیدہ و دانستہ بنائے نفاق اور چند افسران اور مخالف ہنود انگلش پریس کا زائیدہ قرار دیا۔

غلط فہمی مسلمانوں کی متفقہ سیاسی پالیسی کے انتشار اور قومی مرکزیت کے تباہ ہو جانے کے بعد یا سیاسی خیالات کی ترقی سے بعض مسلمان دماغوں میں بھی یہی غلط فہمی جاگزین ہو گئی ہے کہ یہ ڈیپوٹیشن حکومت کے اشارے سے مرتب ہوا تھا حالانکہ واقعات کی رفتار صاف بتا رہی ہے کہ اُردو، ہندی کے قضیئے کے بعد جو حالات پیش آئے اور جو سیاسی تحریک قوم میں پیدا ہوئی اور نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک کو قومی ترقی اور سیاسی جمود دُور کرنے کا جو خیال ہوا یہ ڈیپوٹیشن اُس کا نتیجہ تھا۔

مسٹر آرچبولڈ کا خط اس بات کو بھی ظاہر کر رہا ہے کہ حکومت کو تو اس خواہش سے ابتداءً ایک قسم کا تردد تھا اور اُس نے شرطیں بھی کی تھیں۔

خط موسومہ ہز ہائی نس سر آغا خاں

بہر حال اس مرحلہ کے بعد بھی اس سلسلہ میں حکومت سے مراسلت، منظوری مطالبات کی کوشش اور دیگر جد و جہد کے مراحل اور سطے کرنے تھے اسلئے نواب محسن الملک نے ہز ہائی نس سر آغا خاں کو حسب ذیل خط لکھا :-

مائی ڈیر- آپ کا تار اٹارسی سے پہونچا- آپ کی علالت کی خبر سن کر بہت فکر و پریشانی ہوئی- خدا سے دعا ہے کہ آپ جلد اچھے ہو جائیں- جو ڈیپوٹیشن آپ کی افسری میں شملہ گیا تھا اُس کو زندہ رکھنا نہایت ضروری ہے اور اس کے لئے یہ خیال ہے کہ ایک کمیٹی مقرر ہو اور ممبران ڈیپوٹیشن اُس کے ممبر ہوں اُن کا صرف یہ کام ہو کہ جو درخواستیں ایڈریس میں کی گئی ہیں اُن کی تکمیل کے لئے وقتاً فوقتاً گورنمنٹ سے خط و کتابت کرے اور میٹیریل جمع کرتی رہے- یہ کام درحقیقت اُس انجمن کا تھا جو کل ہندوستان کے لئے ہوتی یعنی سینٹرل پولیٹکل ایسوسی ایشن فار انڈیا- مگر چونکہ کوئی ایسی انجمن موجود نہیں ہے اور اُس کے قائم ہونے میں بہت دقتیں ہیں اس لئے کہ ہر صوبہ والا اپنے ہی صوبہ میں قائم کرنے کی خواہش کرتا ہے اور میں اپنے تجربہ سے کہہ سکتا ہوں کہ کہیں کسی صوبہ میں کوئی ایسا شخص موجود نہیں ہے جو اُس کو چلا سکے مگر بوجہ حسد کے کسی ایک جگہ اوس کا اتفاق ہونا مشکل ہے اس لئے میں نے ایک تجویز کی ہے جس کا آپ کے نام سے شائع ہونا ضرور ہے اور چونکہ آپ مسلمانوں کے مسلّمہ لیڈر گورنمنٹ اور پبلک دونوں کے نزدیک ہو گئے ہو اس لئے جو تجویز آپ کی طرف سے پیش ہوگی کم لوگ اُس کی مخالفت کرینگے- اسلئے میں ایک مسودہ خط کا جو آپ کی طرف سے میرے نام ہوگا آپ کے ملاحظہ کے لئے بھیجتا ہوں اگر آپ اس کو منظور کریں تو بعد رد و بدل مناسب کے دستخط فرما کر میرے پاس بھیجدیں- اگر آپ نے اس تجویز کو منظور فرما لیا تو آیندہ کی جو تجویزیں میرے خیال میں

ہیں اُن سے آپ کو مطلع کروں گا۔

مسلم لیگ کا قیام اور آخری کوشش

چنانچہ ہز ہائی نس سر آغا خاں نے اس تجویز کو منظور کیا اور گشتی خطوط کی اشاعت کی گئی مگر اسی قریب زمانہ میں ۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ء کو بمقام ڈھاکہ مسلمانوں کا ایک نمائندہ جلسہ منعقد ہوا اور اُس نے ایک سیاسی انجمن مسلم لیگ کے نام سے قائم جانے کا فیصلہ کر دیا[۵۱] نیز لیگ کے ضوابط و قواعد مرتب کرنے کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی گئی۔

نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک اُس کے سکریٹری منتخب ہوئے اور اُنکو مجاز کیا گیا کہ ترتیب ضوابط کے بعد مسلمانوں کا ایک عام جلسہ طلب کر کے اُنکو آخری منظوری کے لئے پیش کریں۔

اگرچہ نواب محسن الملک واقعۂ شورش[۵۲] طلبا اور اس سلسلہ کی بعض دوسری کارروائیوں سے دل شکستہ تھے اور امراض کا بھی غلبہ تھا لیکن اس سیاسی جد و جہد کے کامیاب نتیجہ کے لئے برابر کوشش کرتے رہے۔

ہنوز ۳۰ دسمبر کے فیصلہ کے مطابق مسلم لیگ کی تکمیل نہ ہوئی تھی کہ اگست ۱۹۰۶ء میں اصلاحات مجوزہ کی نسبت گورنمنٹ کا تفصیلی اعلان شائع ہو گیا جس کے بعد مسلمانوں کو اپنے مطالبات کے متعلق جلد از جلد اور زیادہ جد و جہد کی ضرورت تھی۔

نواب محسن الملک نے فوراً مسلمانوں کے ممتاز و سر برآوردہ اصحاب کو متوجہ کیا اور نواب وقار الملک کو لکھا[۵۳] کہ وہ بلا انتظار مسلم لیگ کی طرف سے کارروائی شروع کریں، پھر آخر ستمبر میں اسی غرض سے شملہ گئے اور جب تک جسم اور دل و دماغ میں طاقت رہی ان ہی مقاصد میں صرف کرتے رہے۔

---

۵۱ اس جلسہ کی روداد انگریزی مولانا محمد علی مرحوم نے مرتب کی تھی جس میں انہوں نے دیباچہ بھی تحریر کیا تھا۔ ۵۲ ملاحظہ ہو باب آئندہ ۵۳ مکاتیب حصۂ اوّل۔

آخری خط ان کوششوں کے سلسلہ کا مؤلف کو آخری خط جو دستیاب ہوا وہ انتقال سے پندرہ دن پہلے مولوی عبداللہ جان وکیل سہارن پور کے نام تھا جس میں لکھتے ہیں کہ:۔

دو تین روز ہوئے میں یہاں آگیا ہوں اور متعلق ریفارم مجوزہ کے گورنمنٹ کے خاص خاص حاکموں سے گفتگو ہو رہی ہے ۔

منشا گورنمنٹ کا یہ ہے کہ جو تجویزیں آپ نے پیش کی ہیں ان پر کامل بحث اور کافی غور کیا جائے اور پبلک اپنی رائے آزادی کے ساتھ دے اور اس میں جو اصلاحیں معلوم ہوں اُن کو پیش کرے تاکہ بعد آجانے تمام راؤں کے گورنمنٹ اس پر غور کر کے قطعی فیصلہ کرے مسلمانوں کے لئے نہایت نازک وقت کام کرنے کا ہے اور ان کو چاہیئے کہ گورنمنٹ کے منشار کے موافق اسکی تجویزوں کی نسبت اپنی رائے صاف صاف دیں اور متفق ہو کر متفقہ یادداشت پیش کریں آل انڈیا مسلم لیگ کے ذریعہ سے اس کام کا ہونا مناسب ہے اور جس طرح پر ڈپوٹیشن کے وقت سب ہندوستان کے معزز مسلمانوں نے مل کر کام کیا تھا ویسا ہی اب ریفارم کے متعلق مل کر کام کرنا چاہیئے کسی خیال خاص سے اختلاف کرنا اور اپنی طرف سے علیحدہ علیحدہ کارروائی کرنا مناسب نہ ہوگا اس لئے میں آپ کی توجہ اس طرف چاہتا ہوں کہ جو تحریریں نواب وقارالملک بہادر سکرٹری مسلم لیگ کی طرف سے آپ کے پاس پہونچیں اُن پر آپ غور کریں اور ایک جلسہ میں اپنی تجویزیں بطور یادداشت کے تحریر کر کے اُن کے پاس بھیجیں تاکہ بعد آجانے تمام راؤں کے پھر ایک یادداشت مرتب کی جاوے اور کراچی میں جب کہ کانفرنس کا اجلاس ہوگا ان ہی دنوں میں کوئی ایک دن ان کے تصفیہ کے لئے مقرر کیا جائے

اور جو آخری یادداشت گورنمنٹ میں بھیجی قرار پائے گی وہاں مرتب کرلی جائے اس کام میں اگر ذرا غفلت یا تاخیر کی گئی یا کسی غلط خیال سے اختلاف کیا گیا اور ملکر کارروائی نہ کی گئی تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ایسا نقصان مسلمانوں کو پہنچے گا جس کی تلافی نہ ہو سکے گی۔

دوسرا امر لائق گزارش یہ ہے کہ یہاں آکر مجھے معلوم ہوا کہ بجائے اسکے کہ ایک بڑی مجلس کر کے شکریہ کا تار وائسرائے کے حضور میں بھیجا جائے مناسب یہ ہے کہ مختلف مقامات میں جلسے کئے جاویں اور مختلف انجمنوں کے ذریعہ سے علیحدہ علیحدہ شکریہ کے تار وائسرائے کے حضور میں بھیجے جاویں، اس کا اثر بھی اچھا ہوگا اور پبلک اور گورنمنٹ کو مسلمانوں کی دلچسپی کا یقین ہوگا اس لئے میں آپ سے چاہتا ہوں کہ آپ اس کا انتظام کریں اور نواب وقار الملک بہادر سکرٹری آل انڈیا مسلم لیگ اس کے متعلق آپ کو لکھیں گے اس کام میں غفلت نہ کرنی چاہیئے ایک مسودہ تار کا جو تحریر کیا گیا ہے آپ کے ملاحظہ کے لئے بھیجتا ہوں جو تار شکریہ کا آپ کی طرف سے بھیجنا چاہیئے اس میں بہ تبدیل الفاظ اگر ایسا ہی مضمون ہو تو مناسب ہوگا آپ نہ صرف اپنی انجمن کی طرف سے ہی تار بھجوائیے بلکہ دیگر انجمنوں کی طرف سے بھی جن کو آپ جانتے ہوں اگرچہ لکھنؤ کی راہ سے آیا تھا مگر رات کا وقت تھا اس لئے آپ کو اطلاع نہیں دی اور اسٹیشن پر آنے کی زحمت سے بچایا، میری طبیعت بدستور ہے شاید یہاں کی آب و ہوا کچھ فائدہ کرے"

مطالبات کی اہمیت

جو مطالبات ایڈریس میں پیش کئے گئے تھے وہ مسلمانان ہند کے بنیادی حقوق ہیں اور جب تک

کہ ہندوستان کے تمام فرقے صحیح تعریف کے ساتھ ایک قوم نہیں بنتے اور فرقوں کی تفریق موجود ہے اسی تحدید وتعین پر باہمی تعلقات، باہمی اعتماد اور ملک کے امن کا انحصار رہے گا۔

میثاق لکھنؤ ۱۹۱۶ء چیمسفورڈ، مانٹیگو اسکیم ۱۹۱۸ء نہرو رپورٹ ۱۹۲۸ء، آل انڈیا مسلم کانفرنس ۱۹۲۹ء اور کمیونل اوارڈ ۱۹۳۲ء سب میں حقوق کی یہی تعین وتحدید مسلمانوں کے سیاسی وجود وبقا کی ضمانت ہے، دوسری قسط اصلاحات ۱۹۲۱ء کے بعد تیسری قسط ۱۹۳۴ء تک کے درمیان اس کی اہمیت اور بھی زیادہ ثابت ہو رہی ہے۔

اگرچہ ان مطالبات اور اس تحدید وتعین حقوق کے خلاف ہندو سیاسیین نے پوری جد وجہد کی مگر حکومت ہند، وزیر ہند اور دارالعوام نے تسلیم کیا اور ۱۹۰۹ء کی منٹو، مارلے رفارم اسکیم میں قانونی شکل دیدی گئی۔

نواب محسن الملک کا نہ صرف اپنی قوم پر بلکہ سیاسی رقابتوں اور تلخیوں سے محفوظ رہنے کے لیئے تمام ملک پر یہ احسان عظیم ہمیشہ باقی اور یادگار رہے گا۔

ان کی اس پالیسی کی وقعت بعد کے واقعات سے اور بھی زیادہ ہو گئی ہے جبکہ اصلاحات کے دو مواقع پر باوجود اس اتحاد اور کانگریس کی شرکت کے مسلمانوں نے اپنا تحفظ اسی تحدید وتعین میں سمجھا اور بالآخر ۱۹۳۴ء کی کانگریس کے کھلے اجلاس نے کمیونل اوارڈ کے خلاف خاموشی پسند کی۔

اس میں شک نہیں کہ مسلمان من حیث القوم اکتوبر ۱۹۰۶ء تک سیاسیات عامہ سے علیحدہ رہے اور ان کے مخصوص حالات جو ہندوستان کی کسی اور قوم کو پیش نہیں آئے اسی کے متقاضی تھے لیکن جب وقت آگیا اور حالات پر اطمینان اور قابو ہو گیا تو نواب محسن الملک نے اپنی قوم کو سیاسیات ہند میں ایک

منظم جماعت بنا دینے میں حیرت انگیز قوت ظاہر کی اور گو وہ اس کا نتیجہ حاصل کرنے کے لئے زندہ نہ رہے مگر ان کے بعد ان کے جانشینوں اور ان کی قوم نے بالآخر وہ نتیجہ حاصل کر لیا۔

سیاسی شورشوں کے متعلق تنبیہ

انیسویں صدی کے خاتمہ تک اگرچہ حکومت کے شبہات و اوہام سے مسلمانوں کی سیاسی زندگی کا مطلع بہت کچھ پاک و صاف ہو چکا تھا لیکن دستوری ترقیوں میں انکو اپنی ناکامی و نامرادی کے احساس نے اب متردد اور بے چین کرنا شروع کر دیا تھا، اور گذشتہ سات سال میں سیاسی ارتقار کے ساتھ زیادہ ذہین اور پُرجوش نوجوانوں میں حکومت کی طرف سے یک گونہ مایوسی بھی تھی، چنانچہ شملہ ڈپوٹیشن کے ایڈریس میں بھی یہ کہا گیا تھا کہ "بعض واقعات نے جو حال میں پیش آئے ہیں عام طور پر اور خصوصًا نوجوان مسلمانوں میں ایک جوش پیدا کر دیا ہے جس سے اندیشہ ہے کہ بعض صورتوں اور مجبوریوں میں وہ جوش حد اعتدال سے گذر جائے اور بزرگوں کا نیک مشورہ اور معتدل ہدایت جس کا وہ اب تک اتباع کرتے آئے ہیں ان کے قلوب پر موثر نہ ہو سکے" اب جو حالات مسلسل و متواتر پیش آ رہے تھے اور ملک میں حکومت کے خلاف مقاطعہ و نفرت کی جو تحریک پھیل رہی تھی اس سے نواب محسن الملک نے اس خطرہ کا کہ مبادا مسلمان بھی اس تحریک میں شریک ہو جائیں زیادہ احساس کیا ان کو اپنی قوم کی حالت اس کے رہنما افراد کی ہمت و قابلیت اور استقلال و عزم کا بھی تجربہ تھا اور جانتے تھے کہ ان کی قوم کے لئے ایسا اقدام ہلاکت آفریں ہوگا نیز حقوق کے متعلق جو مطالبات پیش کئے تھے ہنوز ان کے لئے صبر و امید کی ضرورت تھی علاوہ بریں ان کے نزدیک مسلمانوں کے لئے اس پولیٹیکل ایجی ٹیشن میں شرکت کی کوئی وجہ قوی نہ تھی اس لئے انہوں نے دلائل و براہین کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا اور سنہ ۱۹۰۶ء میں پریس کو ایک بیان دے کر نوجوانوں کو متنبہ کیا کہ :...

وواگر ہندو گروہ کے وہ لوگ جو شورش پھیلاتے ہیں تاج برطانیہ کی بدخواہی
کے لئے کوئی عذر یا بہانہ نکال سکیں تو ہم کو پروا نہیں ہے مگر یہ امر یقینی طور پر
معلوم ہے کہ ہندوستان کے مسلمان اس کے لئے کوئی معقول عذر پیش
نہیں کر سکتے۔ مسلمانوں کی حالت تو یہ ہے کہ وہ پارسیوں کی طرح تاج برطانیہ
کے اس لئے شکر گزار ہیں کہ ہندوستان میں اُن کی ہستی کا قیام انگریزی گورنمنٹ
کے قیام پر منحصر ہے ان دونوں قوموں کے لئے یہ امر یقیناً بیہودہ ہوگا کہ
وہ ایسے منصوبے کی مدد کریں جس کا مقصد یہ ہو کہ وہ اسی طاقت کی بیخ کنی
کریں جس کے سبب سے اُن کو مذہبی آزادی، رائے اور خیالات کی آزادی،
تجارتی آزادی اور وہ آزادی حاصل ہے جس سے وہ بحیثیت ایک مستقل گروہ
کے اس ملک میں زندگی بسر کرتے ہیں میری رائے میں اس شورش کا آخری
نتیجہ ہندوستان کی تباہی ہوگا یہ شورش جس وسیع پیمانہ پر ہے اس کو ہم میں
سے اکثر آدمی تسلیم کرتے ہیں میں نے بذات خود جو کچھ دیکھا اور سُنا ہے
اُس کے لحاظ سے میں یقین کرتا ہوں کہ اخبارات میں شورش کے جو واقعات
درج کئے جاتے ہیں اُن سے اصلی واقعات کے صرف نصف حصے کا اندازہ ہوتا
ہے اس خطرناک جوش کو شروع ہی میں روکنے کے لئے حکام کو بہت سخت
تدبیروں سے کام لینا ضروری ہے جو مسلمان شورش میں شریک ہوں اُن کے
پاس کوئی معقول عذر گورنمنٹ کی بدخواہی کے لئے نہیں ہو سکتا یہ ایک ایسا
واقعہ ہے جس کو ہم کبھی نظر انداز نہیں کر سکتے کہ یہ انگریزوں ہی کی آمد تھی جس
نے دلّی کی اسلامی حکومت کو مرہٹوں اور سکھوں اور راجپوتوں میں تقسیم
ہونے سے بچایا اور صرف اسی امر کے لحاظ سے ہندوستان کے تمام
مسلمانوں کو تاج برطانیہ کے ساتھ وفادار رہنا چاہئے۔ مگر میرے نزدیک

ہندوستان کی دیگر قوموں کو بھی اس بنا پر گورنمنٹ کے ساتھ وفادار رہنا چاہیے کہ یہ امر صرف انگریزی حکومت ہی میں ممکن ہے کہ ہندوستان کی مختلف قوموں کی مشترک اغراض باہمی اتحاد کے ساتھ وابستہ رہیں۔"

ہندوؤں سے تعلقات

سیاسیات ہند کا نازک اور اہم مسئلہ "ہندو مسلم اتحاد" ہے اور اسی پر ملک کی ترقی و آزادی منحصر ہے، نواب محسن الملک کا بھی یہی عقیدہ اور عمل تھا، انفرادی حیثیت سے ان کے بہت سے ممتاز ہندوؤں سے ساتھ ذاتی و خاندانی تعلقات تھے، حیدرآباد میں ان کے افسرانہ فیض سے ہندو بھی بہرہ یاب تھے، اُنہوں نے ایک موقع پر بیان کیا تھا کہ :۔

"میں اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھتا ہوں کہ جس قدر میرے دوست میری قوم کے ہیں اس سے کچھ کم ہندو اور پارسیوں میں نہیں بلکہ یہ کہنا مبالغہ سے خالی ہوگا کہ بعض اُن میں ایسے ہیں جن کی عزت اور قدر میرے دل میں اپنے بھائیوں سے بڑھ کر ہے اور میں دیکھتا ہوں کہ وہ بھی مجھے اپنا دوست سمجھتے اور میرے ساتھ نہایت محبت سے پیش آتے ہیں۔"

لیکن ایک قومی لیڈر کی حیثیت سے اُن کو ایسے مقاصد و خیالات سے جن کو وہ اپنی قوم کے لئے نقصان رساں اور خطرناک تصور کرتے تھے اختلاف کرنا ناگزیر تھا، کانگرس سے علیحدگی بھی اسی نظریہ کی بنا پر تھی تاہم ان دونوں قوموں کے درمیان جو خلیج حائل ہوگئی تھی اُس کے پُر ہوجانے کے انتہائی آرزومند تھے۔

مدراس کانفرنس کے اجلاس میں قومی تعلقات پر اظہار خیال

چنانچہ ۱۹۰۱ء میں اولین موقع پر جب بمقام مدراس کانفرنس کے اجلاس میں ہندو ذرٹیرس بھی آئے تو نواب محسن الملک نے ریسپشن کمیٹی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اُن کو مخاطب کرکے کہا کہ :۔

"صاحبو، ہندوستان میں جب تک ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے ہمدرد
نہ ہوں گے اور آپس میں دوستانہ برتاؤ نہ رکھیں گے اور فراخ حوصلگی اور بے
تعصبی سے ایک دوسرے کے ساتھ پیش نہ آویں گے وہ ملکی بھائی اور ہموطن
کہلانے کے مستحق نہ ہوں گے اور جو کوئی مسلمان ہو یا ہندو باہمی دوستانہ
برتاؤ کے قائم رکھنے اور ترقی دینے میں سعی نہ کرے گا وہ درحقیقت ملکی اور
قومی گنہگار ہوگا مگر مجھے اس موقع پر ایک کلمہ کہنے کی اور اجازت دیجیے میں نے
بعض اخباروں میں دیکھا تھا کہ یہاں بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ علی گڑھ
پارٹی کے مسلمان ہندوؤں کے مخالف ہیں اور ان کے تعلقات ہندوؤں کے
ساتھ دوستانہ نہیں ہیں، صاحبو، یہ خیال بالکل غلط ہے اور ہم شمالی ہند
کے رہنے والوں پر تہمت ہے، ہم ہندو اور مسلمان بھائی بھائی ہیں ہمارا
باہمی برتاؤ دوستانہ ہے ہم ایک دوسرے کے رنج و راحت میں شریک ہیں
غالباً یہ خیال ان اختلافات سے پیدا ہوا ہے جو ہمارے اور آپ کی بعض
پولیٹکل کارروائیوں میں ہیں جن میں ہم اور اس صوبہ کے ہندو بھائی متفق
الرائے نہیں ہیں مگر اول تو اس کی خصوصیت مسلمانوں ہی سے نہیں ہے خود
ہمارے صوبہ کے بعض ہندو بھی ہمارے ہم خیال ہیں علاوہ بریں کسی خاص
پولیٹکل مسئلہ میں اختلاف رائے کا ہونا درحقیقت مخالفت نہیں ہے اور اس سے
دوستانہ تعلقات میں فرق نہیں آسکتا اگر ہم اور ہمارے ہندو بھائی مذہبی
خیالات اور قومی رسموں میں متفق نہیں ہیں تو یہ اختلاف ہمدردی اور دوستانہ
برتاؤ کا مانع نہیں ہے اس طرح اگر ہم اور وہ بعض پولیٹکل اور ملکی مسائل میں
ہم خیال نہ ہوں تو اس سے لازم نہیں آتا کہ ہم میں اور ان میں دوستی اور
ہمدردی نہ ہو، رائے کا اختلاف اور چیز ہے اور مخالفت دوسری بات ہے

اور میں اس بات کے ظاہر کرنے سے خوش ہوں کہ ہمارے اور ہندو بھائیوں کے معزز اور سمجھدار لوگ گو باہم بعض پولیٹیکل امور میں مختلف الرائے ہوں، مگر ایک دوسرے کے مخالف نہیں ہیں۔"

ان کی ہمیشہ پبلک اور پرائیویٹ کوشش یہی تھی کہ سیاسی اختلاف آرا کو قومی و ذاتی مخالفت سے علیحدہ رکھا جائے اور یہ دونوں قومیں ملک میں اتحاد و امن کیسا تھ ترقی کریں لیکن بدقسمتی سے چند ہی سال میں صورت اور بھی زیادہ مہیب ہو گئی اور ہندو سیاسین کو بھی اتحاد کی ضرورت محسوس ہوئی۔

ہندو مسلم اتحاد پر ایک تقریر

۱۹۰۶ء کے اوائل میں آنریبل مسٹر گوکھلے جو اُسوقت کانگریس کے نہایت ممتاز اور مقتدر رکن تھے اور جنکو اس اتحاد کی اہمیت کا پورا اندازہ تھا اور اُس کے لئے شمالی ہند کے شہروں میں دورہ کر رہے تھے لکھنؤ بھی آئے اُن کے اعزاز میں بڑی شاندار دعوت کی گئی اُس میں نواب محسن الملک بھی مدعو تھے، حاضرین کی عام خواہش اور مسئلہ کی اہمیت کے لحاظ سے معزز مہمان کے جام صحت کی تائید کرتے ہوئے نواب صاحب نے اُن کی کوششوں کی تعریف اور اتحاد کی ضرورت پر مختصراً اظہار خیال کر کے مسلمانوں کے قومی نقطۂ نظر کی وضاحت میں کہا کہ :-

"صاحبو - یہ مسئلہ ایسا نہیں ہے کہ اِس کی خوبی اور ضرورت میں کسی کو بھی شک یا اختلاف ہو - مگر جو سوال کہ اس وقت ہمارے سامنے پیش ہے وہ یہ نہیں ہے کہ ہندو اور مسلمانوں میں باہمی اتحاد کا ہونا مفید اور ضروری ہے، یہ تو ایک مسلمہ اور طے شدہ مسئلہ ہے - سوال یہ ہے کہ یہ اتحاد کیونکر حاصل ہو اور اُس کے قائم ہونے کا کیا طریقہ ہے، پچھلے زمانہ میں جب کہ مغربی تعلیم سے ہندوستان بے خبر اور اس دولت سے محروم تھا، ہندو اور مسلمانوں میں ایسا اتحاد اور ارتباط

تھا کہ سوائے مذہبی معاملات کے کسی بات میں مغائرت اور بیگانگی معلوم ہوتی تھی، ایک دوسرے سے محبت و دوستی رکھتا تھا، شادی و غمی کی تقریبوں میں دونوں دوستانہ بلکہ برادرانہ شریک ہوتے تھے۔ نہ کچھ جھگڑا تھا، نہ قضیہ، نہ دشمنی تھی، نہ عداوت، یہ مبارک زمانہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور وہ دلربا تصویر باہمی اتحاد کی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ اُسوقت اتحاد کی ضرورت اور فوائد پر نہ لکچر دیئے جاتے تھے، نہ وعظ کیے جاتے تھے لیکن جب سے مغربی تعلیم ہندوستان میں پھیلی ہے روز بروز اختلاف بلکہ مخالفت پیدا ہوتی جاتی ہے اور دوستی کی جگہہ باہمی نفرت بڑھتی جاتی ہے۔ اتحاد اور ارتباط کی خوبی اور ضرورت پر بڑے بڑے لکچر دیے جاتے ہیں، بہت پُرجوش تقریریں کی جاتی ہیں، مگر عملاً اختلاف دُور کرنے اور اتحاد پیدا کرنے کی کوئی تدبیر نہیں کی جاتی۔ میں نہیں سمجھتا کہ یہ مقصد فصیح و بلیغ لکچروں کے دینے اور اتحاد و ارتباط کی خوبی پر پُرزور تقریریں کرنے سے حاصل ہوگا، جب تک کہ کہنے والے خود اُن باتوں کو دُور نہ کریں جو باعث اختلاف اور ذریعہ مخالفت ہیں، میں دیکھتا ہوں کہ جو غار ہندو اور مسلمانوں کے بیچ میں حائل ہے بعض سنگدل اور ملک دوست اُس پر پُل باندھنے اور اُس کو ہموار کرنے کی ضرورت سمجھتے اور اُس کے لیے نصیحت کرتے ہیں، مگر افسوس ہے کہ روز بروز وہ غار زیادہ گہرا، زیادہ چوڑا ہوتا جاتا ہے، زبان سے کہا جاتا ہے کہ اینٹ لاؤ، چونہ لاؤ، اور اس غار کو برابر کردو، مگر ہاتھ میں پھاوڑے اور کدال ہیں، اور بجائے بھرنے کے وہ غار اور وسیع اور عمیق کیا جاتا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہندو اور مسلمانوں میں ایسے لوگ نہیں ہیں جو ایسے اتحاد کے خواہاں نہوں، یا جو کچھ وہ کہتے ہیں اُسکو عمل میں لانے کی دلی خواہش نہ رکھتے ہوں۔ خصوصاً میں اپنے معزز دوست

آنریبل مسٹر گوکھلے کی نسبت تو اس کا گمان اور شبہ بھی نہیں کر سکتا۔ بلکہ برخلاف اس کے مجھے یقین ہے کہ جو لفظ اُن کی زبان پر آتا ہے وہ دل سے نکلا ہوا ہوتا ہے، اور جو کچھ وہ کہتے ہیں دل سے اُس کے عمل میں لانے کے خواہاں ہیں۔ میں بھی صدق دل سے باہمی اتحاد کا خواہاں ہوں اور میں فخریہ کہہ سکتا ہوں کہ میرے دوست جس قدر پارسی اور گجراتی اور ہندو ہیں وہ مسلمانوں سے کچھ کم نہیں ہیں اور باوجود بعض پولیٹکل اختلافات کے اکثر پارسی اور ہندو مجھ سے ایسے دوستانہ برتاؤ رکھتے ہیں جس سے بہتر ممکن نہیں، اور اُن میں سے بعض ایسے ہندو اور پارسی ہیں جن کی میں عزت دل سے کرتا ہوں اور جن کی قابلیت اور حب وطن اور ملکی ہمدردی کی عزت میرے دل میں ویسی ہی ہے جیسی کہ اپنے بزرگ سر سید مرحوم کی تھی، اُن ہی میں سے میرے معزز دوست آنریبل مسٹر گوکھلے ہیں۔ مگر اُن کو اور ہم کو اور اُن لوگوں کو جو درحقیقت اتحاد کے خواہاں ہیں، سمجھ لینا چاہیئے کہ اس مہلک بیماری کا علاج زبان سے نہیں ہو سکتا بلکہ ہاتھ سے، یہ اختلاف پلیٹ فارم پر فصیح و بلیغ لکچر دینے سے دور نہیں ہو سکتا بلکہ وجوہ اختلاف پر غور کرنے اور اُس کے دفع کرنے کی تدبیروں کے عمل میں لانے سے ہو سکتا ہے۔ مگر نظر اُٹھا کر دیکھیئے کہ موجودہ حالت کیا ہے اور آیندہ کے لئے اُمید کی شکل نظر آتی ہے یا مایوسی کی، اب تک یہ نہیں بتایا جاتا کہ اختلاف کن باتوں میں ہے، اُس کے اسباب کیا ہیں اور دونوں قوموں کے وہ اغراض و مقاصد کیا ہیں جو باعث مخالفت ہیں، اور کہاں تک دونوں قومیں اپنے اُن مقاصد میں سے کچھ حصہ دوسرے کے خیال سے اور دوسرے کے فائدہ کے لئے قربان کر سکتی ہیں۔ یہ تو ناممکن ہے کہ ایک قوم اپنے فوائد اور اپنے اغراض کو بالکل چھوڑ دے اور نہ یہ انصاف ہے کہ کوئی ایک قوم صرف اپنے مقاصد کی کوشش مد نظر

رکھے اور دوسرے کا خیال نہ کرے، اب میں پوچھتا ہوں کہ کیا ایسا کیا جاتا ہے؟ اور کیا مدعیان اتحاد کی طرف سے ایسی کوشش نیک دلی اور سچائی کے ساتھ ہو رہی ہے؟ حالت تو بظاہر مخالف پائی جاتی ہے، ہم سے کہا جاتا ہے کہ ہمارے اُن جلسوں میں شریک ہو جن کو ہم اپنے اغراض کے مخالف پاتے ہیں۔ ہم سے کہا جاتا ہے کہ ہماری اُن باتوں میں ہمارے خیال اور ہمصفیر ہو جن کو ہم اپنے لئے مضر سمجھتے ہیں۔ مگر کوئی ایسی صورت ہمارے سامنے پیش نہیں کی جاتی جس میں ہمارے قومی اغراض کا کچھ بھی لحاظ نہ کیا جاتا ہو۔ بلکہ کوشش کی جاتی ہے کہ ہمکو وہ نقصان شدید پہونچائیں جس سے ہماری قومیت کو سخت صدمہ پہونچے۔ تمثیلاً بمجبوری مجھے یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس صوبہ متحدہ میں جس کے صدر مقام میں اسوقت ہم جمع ہیں اور اتحاد کے مسئلہ پر گفتگو کرتے ہیں، اُردو ناگری کا اہم مسئلہ پیش ہے اور مدعیان اتحاد سالہا سال سے سخت کوشش کر رہے ہیں کہ اُردو کے بجائے ناگری قائم ہو۔ حالانکہ یہ زبان نہ عرب کی ہے نہ عجم کی، نہ مسلمان اسے عرب سے لائے ہیں نہ ایران سے، یہ تو ایک مشترکہ زبان ہے جو ہندوستان میں پیدا ہوئی، ہندو اور مسلمان دونوں اُس کے پیدا کرنے والے ہیں، کئی سو برس سے دونوں میں اُس کا رواج ہے، ہندو بھی اس صوبہ کے وہی زبان بولتے ہیں اور مسلمان بھی، ہندو بھی اُسی خط میں اور اُنہیں حرفوں میں تحریر کرنے کے اُسی طرح عادی ہیں جس طرح مسلمان۔ اُس کے قائم رہنے میں ہندوؤں کا کچھ ہرج نہیں ہے اور اُس کے نہ قائم رہنے میں مسلمانوں کا سخت نقصان ہے۔ مگر مسلسل کوشش اُس کے معدوم کرنے کے لئے ہو رہی ہے اور جب تک وہ معدوم نہ ہو جائے گی غالباً ہمارے دوستوں کی کوشش میں کمی نہ ہوگی۔ اب فرمائیے کہ اگر اتحاد کے وعظ کہنے والے یہ چاہتے ہیں کہ ہم اُن کی کوشش کا مقابلہ نہ کریں اور اپنی زبان

ہے کے قائم رکھنے کے لئے بھی اُن کے حملوں کو دفع نہ کریں اور اگر ایسا کریں تو ہم اتحاد کے دشمن اور مخالفت کے پیدا کرنے والے سمجھے جائیں تو اس میں قصور ہمارا ہے یا ہمارے دوستوں کا، ایسا اتحاد تو وہی شخص چاہے گا جو اپنی قومیت کی مخصوص علامت کے ترک کرنے کی پرواہ نہ کرے، بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ اپنی قوم کو دوسری قوم میں جذب ہو جانے کو اتحاد سمجھے۔ ہم تو اس کو اتحاد نہیں سمجھتے۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں قوموں میں ایسے خیالات پیدا ہو گئے ہیں کہ روز بروز مخالفت بڑھتی جاتی ہے اور پولیٹیکل اختلاف کا اثر تمدن اور معاشرت کے اتحاد پر پڑتا جاتا ہے دلوں میں ایسے زخم ہو گئے ہیں کہ اُن کے اچھے ہونے کی بہت کم اُمید ہے اور جو علاج اُس کا کیا جاتا ہے وہ بالائی اور ظاہری ہے اُس سے کچھ فائدہ نہیں ہوتا اور نہ ہو سکتا ہے۔ کیا آپ سمجھ سکتے ہیں کہ کسی کے جگر میں پھوڑا ہو اور وہ اندر ہی اندر بڑھتا اور پھیلتا جاتا ہو، پیپ پڑ رہی ہو، اُسے کوئی ریشمی اور خوش نما کپڑا رکھ دینے سے اچھا کر سکتا اور اُس کا درد دور کر سکتا ہے؟ اُس کے لئے ضرورت اس بات کی ہے، کہ پھوڑا چیرا جائے، اُس کی آلائش نکالی جائے اور پھر اُس پر مرہم رکھا جائے، ہندو اور مسلمانوں کی مخالفت کی بھی یہی حالت ہے۔ دلوں میں نفرت بڑھتی جاتی ہے، پرانے دلخراش بھولے ہوئے قصے یاد دلائے جاتے ہیں۔ اخباروں میں دل شکن اور نفرت انگیز باتیں لکھی جاتی ہیں جو کوششیں اپنے قومی فائدہ کے لئے کی جاتی ہیں اس پر حملے کئے جاتے ہیں۔ غرض کہ بجائے ہمدردی کے بے دردی کا، اور بجائے دوستی کے دشمنی کا برتاؤ کیا جاتا ہے، اور یہ حالت روز بروز ترقی پر ہے۔ ایسی حالت میں ایک دو نیک دل اور راستباز ہندو یا مسلمانوں کے روکنے اور سمجھانے سے کیا ہو سکتا ہے۔ پھر جو لوگ سمجھاتے ہیں وہ دوسری قوم کو نہ کہ اپنی قوم کو۔ حالانکہ سمجھانا چاہیئے اپنی قوم کو اور

ہر قوم کے لیڈر کو اپنا رسوخ اور اپنا اثر ڈالنا چاہئے اپنی ہی قوم پر، تاکہ اُس کے دل پر نصیحت کا اثر ہو اور اُس کے سمجھانے سے کچھ فائدہ حاصل ہو۔ مسلمان لیڈروں کو چاہئے کہ وہ اپنی قوم کو اُن باتوں کے کرنے سے روکنے کی کوشش کریں جن میں اُن کا کوئی بڑا مذہبی یا قومی نقصان نہ ہو اور جن کے کرنے سے اُن کے ہموطن ہندو بھائیوں کو رنج ہوتا ہو۔ اسی طرح ہندو لیڈروں پر لازم ہے کہ وہ اپنی قوم کو نصیحت کریں کہ جو کام اُن کے لئے بہت سخت نقصان پہنچانے والے نہ ہوں اور مسلمانوں کو اُس سے فائدہ ہو اُس میں مسلمانوں کی مدد کریں، مگر اس سے کچھ فائدہ نہ ہوگا کہ مسلمان ہندوؤں کو اور ہندو مسلمانوں کو ہدایت اور نصیحت کریں اور صرف اپنے اپنے فائدوں ہی کا خیال رکھیں۔ اُس کا نمونہ ہز مجسٹی امیر کابل نے ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے اور ہندوؤں کی دلشکنی کے لحاظ سے گائے کی قربانی نہ کرنے کی نصیحت کی ہے، یہی اصلی اتحاد پیدا کر دینے کی صورت، اور یہی سچّی اور دلی محبّت قائم کرنے کی شکل ہے۔ کاش ہم لوگ اُسے پیش نظر رکھیں اور ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کا خیال کریں اور ایک دوسرے سے کچھ کچھ اپنے فوائد کا نقصان گوارا کریں، مجھے اُمید ہے کہ میرے معزز دوست بھی میری اِس رائے سے متفق ہونگے اور اُن کا بھی یہ خیال ہوگا اور اُسی پر وہ عمل کریں گے۔ ہم کو اُن کی نیک دلی اور ایمان داری اور سچائی اور بے غرضی اور بے تعصبی سے اُمید ہے کہ اُن کی کوشش میں کامیابی ہوگی اور اُن کی محنت جو وہ اپنے ملک کی بہبودی اور مسلمان اور ہندوؤں میں اتحاد پیدا کرنے کے لئے کرتے ہیں ضائع نہ ہوگی۔ میں اُن کو یقین دلاتا ہوں کہ جو کوشش وہ باہمی اتحاد کے لئے کرتے ہیں اُس میں ضرور اُن کو کامیابی ہوگی، اور ہر ایک نیک دل مسلمان اُن کی سچّی کوشش میں مدد دے گا۔ اگر ہندو بھائی

مسلمانوں کی طرف دو انچ بڑھیں گے تو مسلمان دو گز بڑھ کر اُن کا خیر مقدم کریں گے۔ میں آپ صاحبوں سے معافی چاہتا ہوں کہ میں نے زیادہ دیر تک آپ کی سمع خراشی کی اور اس ضروری موقع پر مجبوری مجھے بعض باتیں ایسی کہنی پڑیں جو شاید کسی کو ناگوار ہوئی ہوں مگر باہمی اتحاد کا مسئلہ ایسا اہم ہے کہ اُس میں صاف صاف کہنا اور جو کچھ دل میں ہے زبان پر لانا ضروری ہے۔"

نواب محسن الملک نے اس تقریر میں جو خیالات ظاہر کیے وہ اصلی اتحاد کے صحیح راستہ سے تعبیر کیے جانے کے قابل ہیں اور جب تک کہ یہ راستہ اختیار نہ کیا جائے گا ان تمام دعاوی و تدابیر اتحاد کا کوئی مستقل نتیجہ نہیں نکل سکتا جن کو ملک کے سامنے اکثر پیش کیا جاتا ہے، چنانچہ ۱۹۱۸ء سے ۱۹۳۲ء تک باوجود دونوں قوموں کی بے انتہا کوششوں کے بار بار ناکامی ہوئی ہوئی، یہی وجہ تھی کہ ہنوز صحیح راستہ نہیں بنایا گیا۔

ایم، اے، او، کالج میں مسٹر گوکھلے کی دعوت

اسی سفر میں جب مسٹر گوکھلے علی گڑھ آئے تو نواب صاحب نے ان کو کالج میں مدعو کیا اور اسٹریچی ہال میں "تعلیم" کے موضوع پر اُن کی تقریر ہوئی، معزز مہمان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے نواب صاحب نے اپنی قومی پالیسی کے متعلق بھی کہا کہ:۔

"وہ پولیٹکل رائے میں اختلاف رکھنے پر مجبور ہیں کیوں کہ وہ اپنی قومیت کو نہیں چھوڑ سکتے، نیز جس طرح ہندو کے ساتھ دوستی ان کا فرض ہے، اسی طرح حکمران قوم کے ساتھ بھی اتحاد اور وفاداری کے خیالات رکھنا اور اُن کو ترقی دینا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔"

کالج کی سرزمین پر یہ پہلا موقع تھا کہ کانگریس کے ایک ہندو لیڈر نے طلبا کو خطاب کیا، اسٹاف اور آنریری سکرٹری کی طرف سے ان کا لنچ اور ڈنر بھی ہوا۔

چند مضامین اور طلبار کو نصیحت

نواب صاحب نے اسی زمانہ میں ہندو مسلم اتحاد کے مسئلہ پر انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں بھی متعدد مضامین شائع کرائے اور طلبار میں اتحاد کا خیال پیدا کرنے کی کوشش کی چنانچہ سرسید کی برسی کے موقع پر اس مرحوم و مغفور رہبر کے ہندوؤں کے ساتھ جو تعلقات محبت و یگانگی تھے ان کا تذکرہ کرکے کہا کہ :- "آخر زمانہ میں البتہ ہندوؤں کو نیشنل کانگریس کے اختلاف سے سرسید سے کچھ شکایت پیدا ہو گئی تھی مگر جیسا کہ خود انہوں نے بارہا کہا کہ یہ اختلاف ایک خاص پولیٹکل تحریک کی نسبت تھا نہ کہ عام اور اس سے انکے مخلصانہ اور دوستانہ برتاؤ میں کبھی فرق نہیں ہوا۔ اگر انہوں نے پولیٹکل ایجی ٹیشن کو ملک کے لئے عموماً اور اپنی قوم کے لیئے خصوصاً مضر سمجھا اور علانیہ اس سے اختلاف کیا تو یہ ویسا ہی اختلاف سمجھا جاسکتا ہے جیسا کہ عقائد کا اختلاف جس کا اثر اصلی دوستی پر نہ تھا نہ ہوا تھا۔

تم کو چاہیئے کہ اتحاد کا سبق بھی ان سے سیکھو اور اپنے ہندو بھائیوں سے سچی دوستی اور خالص دوستانہ برتاؤ رکھو۔ ملک کے لئے عموماً اور قوم کے لئے خصوصاً ایسا اختلاف نہایت مضر ہے۔ اس کو نفرت سے دیکھو اور جو کوئی اس اختلاف کو اچھا سمجھتا اور اس پر عمل کرتا ہو اس کو ملک کا اور خود اپنی قوم کا دشمن سمجھو"

پھر باہمی نفاق و تعصبات کے پیدا ہونے کے وجوہ و اسباب وغیرہ بیان کرکے کہا کہ:-

"میرے عزیزو تم ہرگز سرسید کے پیرو نہ سمجھے جاؤ گے نہ تم تعلیم یافتہ کہلانے کے مستحق ہو گے اگر تم نے اس زہریلے مادے کو اپنے جسم میں سرایت کرنے دیا اور تم نے بھی ہندو مسلمانوں میں کچھ فرق سمجھا اگر تم ایسا کروگے تو اس کا نقصان نہ صرف تم کو ہوگا بلکہ تمہاری ساری قوم کو، اور نہ صرف تم بدنام ہوگے بلکہ یہ کالج بھی بدنام ہوگا اور سرسید پر اس کا الزام آئے گا ...... ہندوؤں کو اپنا بھائی سمجھو

ان کے بزرگوں کو ادب اور عزت سے یاد کرو اُن کے ساتھ محبت اور اخلاق سے پیش آؤ اور اُن کے ساتھ سچا دوستانہ برتاؤ رکھو۔"

خلیفہ اور خلافت ہندوستانی مسلمانوں کو اسلامی سلطنتوں کے ساتھ صدیوں سے قومی تعلق ہے مگر اُنیسویں صدی سے پہلے ملکی سیاسیات پر اس کا کوئی اثر نہ تھا۔

۱۸۷۷ء میں جب حکومت کی مرضی بلکہ ایما سے ایک تنظیم کے ساتھ ترکی مجروحین کے لئے امدادی فنڈ کھولے گئے اور مسلمانوں نے اپنی ہمدردی و دلچسپی ظاہر کی تو اُس کے ساتھ ہی عالمگیر اخوت اسلامی یورپ کے لئے خطرناک وہم بن گئی مگر مسلمانان ہند کے جذبات روز بروز وسیع و قوی ہوتے گئے۔ ۱۸۹۷ء کی فتح یونان کے وقت جو مسلمانوں نے خوشی منائی تو چوں کہ سلطنت برطانیہ کی پالیسی میں تبدیلی ہو چکی تھی اس سے حکومت ہند بھی کچھ متاثر ہوئی۔

یہ ایک زبردست خطرہ تھا جس سے چالیس سال گزشتہ کے واقعہ کی یاد تازہ ہو جانے کا امکان تھا اس لئے سرسید نے متعدد مضامین شائع کر کے ان تعلقات کی وضاحت کی جو ہندوستانی مسلمانوں، ترکوں اور سلطنت برطانیہ میں ہیں۔

نواب محسن الملک کو بھی ایک مسلمان کی حیثیت سے تمام اسلامی سلطنتوں اور بالخصوص ترکی سے عمیق ہمدردی، دلی محبت اور تعلق خاطر تھا اور سلطنت انگریزی کے مفاد کے لئے بھی ان دونوں سلطنتوں کے دوستانہ تعلقات کو نہایت اہم تصور کرتے تھے، چنانچہ ان کے اس مضمون میں جو روسی پیشقدمی کے متعلق تھا یہ جھلک موجود ہے پھر ۱۸۸۸ء میں مسٹر گلیڈاسٹون کی ملاقات میں بھی اُسی ہمدردی کا جذبہ نمایاں ہے لیکن ان کو خلافت کا وہ مذہبی اقتدار جو سیاسیات پر موثر ہو تسلیم نہ تھا۔

۱۹۰۶ء میں جب سرحد عقبہ کے متعلق برطانیہ نے مصر کی حمایت میں ٹرکی کو

الٹیمیٹم دے دیا اور آثار جنگ نمودار ہوئے تو ہندوستانی مسلمانوں نے مختلف مقامات پر عام جلسوں میں برطانیہ کی اس کارروائی پر احتجاج کیا اور بعض لوگوں نے غلط فہمی سے کالج کے ٹرسٹیوں پر ترکی کی نسبت عدم ہمدردی کی بدگمانی پھیلا دی۔

نواب محسن الملک نے اس موقع پر "خلافت و خلیفہ" کے عنوان سے ایک مضمون لکھکر اپنے خیالات اور اپنی پالیسی کو واضح طور پر ظاہر کیا۔ اُنہوں نے تمہید کے بعد سر سید کے مضامین ۱۸۹۷ء سے چند اقتباسات پیش کرکے لکھا کہ:۔[1]

"ہم کو خوب یقین ہے کہ ہماری گورنمنٹ جس کی ہم رعیت ہیں ہمارے خیالات کو خوب جانتی ہے، اور اسے معلوم ہے کہ ہم مسلمان برٹش اور ٹرکش گورنمنٹ کے اتحاد کے نہایت آرزو مند ہیں اور اس کے قائم نہ رہنے سے ہم کو سخت رنج ہوگا اور وہ رنج قدرتی اور فطرتی ہے، پھر کیا ضرور ہے کہ ہم بے فائدہ جلسے کریں وائسرائے کو تار بھیجیں اور غلط فہمی پیدا کرنے کا موقع دیں اگر بالفرض گورنمنٹ پولیٹیکل اسباب سے ترکوں کے ساتھ وہ کارروائی کرے جو ہم کو پسند نہ ہو تو کیا جلسے کرنے اور تار بھیجنے سے وہ اپنے اغراض کو چھوڑ دے گی اور ہماری ہدایت اور رہنمائی یا عرض اور خواہش پر اس خیال سے باز رہے گی جس کو وہ اپنی پولیٹیکل مصلحتوں کی وجہ سے ضروری سمجھتی ہے اور ہم کو اس میں ذرا بھی شبہ نہ تھا اور نہ ہے کہ تا بہ امکان گورنمنٹ ہرگز وہ کارروائی نہ کرے گی جو اُس کے بڑے گروہ رعایا کو رنج دینے والی ہو۔ مگر پولیٹیکل ضرورت سب ضرورتوں سے مقدم ہے۔ افسوس ہے کہ ایک صاف اور صریح معاملہ کو اس قدر طول دیا گیا اور ایک غلط خبر پر رائیں ظاہر کی گئیں بات یہ ہے کہ جو لوگ سلطان کو خلیفہ سمجھتے ہیں وہ یہ بھی خوب جانتے ہیں کہ وہ رعیت برٹش گورنمنٹ کی ہیں اور

---

[1] انسٹیٹیوٹ گزٹ ۳۰ مئی ۱۹۰۶ء

برٹش گورنمنٹ کی وفاداری از روئے مذہب کے ان پر فرض ہے مگر وہ درجۂ اعتدال سے گزر جاتے ہیں جب کہ یہ غل مچاتے ہیں کہ سلطان ہمارے خلیفہ اور ہمارے دین و دنیا کے پیشوا ہیں۔ وہ اگر خلیفہ ہوں اور اُن کے احکام واجب التعمیل ہوں تو صرف اُن پر ہوں گے جو اُن کی رعیت ہیں ہم ان کے کسی حکم کو جو متعلق سلطنت کے ہوں نہیں مان سکتے نہ وہ ہم کو کوئی ایسا حکم دے سکتے ہیں۔ اسی طرح وہ لوگ بھی غلط بتاتے ہیں جو اپنے آپ کو اسلامی سلطنتوں سے بے پروا اور بے تعلق بتاتے ہیں کیا کوئی مسلمان ایسا ہوگا جو کسی مسلمانی سلطنت کو برباد ہوتا دیکھے اور رنج بھی نہ کرے قومی اور مذہبی حیثیت اور ہے اور ملکی اور پولیٹکل حیثیت دوسری۔ بہ لحاظ ہم قوم اور ہم مذہب ہونے کے اگر ہم کو رنج نہ ہو اور ہم ترکوں کی سلطنت کی بربادی کا افسوس بھی نہ کریں تو درحقیقت ہم مسلمان نہیں ہیں اور اگر ہم بحیثیت رعیت ہونے کے اپنی گورنمنٹ کے پورے وفادار اور خیر خواہ نہ رہیں یا کسی حالت میں اس سے انحراف کریں تو ہم وفادار رعیت کہلائے جانے کے مستحق نہیں ہیں۔ سرسید نے کیسی سچائی اور صفائی کے ساتھ اپنے اور تمام مسلمانوں کے خیالات کو اس مسئلہ کے متعلق اس وقت ظاہر کیا تھا جبکہ یونان اور ٹرکی میں لڑائی ہو رہی تھی اور وہی اب بھی ہم کہتے ہیں اور ہمیشہ کہتے رہیں گے کہ ٹرکی ایک مسلمانی سلطنت ہے اگر اس کو واجبی خواہ ناواجبی کچھ نقصان پہنچے تو یہ ایک قدرتی امر ہے کہ ہم مسلمانوں کو ایک دلی رنج ہوگا اور یہ بات ٹرکی ہی پر موقوف نہیں ہے اگر ایران کی سلطنت کو، افغانوں کی سلطنت کو، انہیں کی نادانی اور حماقت اور بدنظمی سے کچھ نقصان پہنچے تو بھی ہم مسلمانوں کو قدرتی رنج ہوگا اور یہی خیال تمام قوموں کا ہے کہ اپنی اپنی قومی سلطنت کے زوال یا نقصان سے رنج ہوتا ہے پس اس سے

زیادہ ان واقعات کو وقعت دینا اور مذہبی لباس پہنانا محض بے جا اور نا واجب ہے
مسلمانوں میں ایک مدت دراز سے بہ لحاظ نسل اور ملک کے ایک قوم ہونے کا اطلاق
بہت کم ہو گیا ہے بلکہ صرف مسلمان ہونا قومیت کی علامت ہو گیا ہے اور کل مومن
اخوۃ کا خیال تمام ملک کے مسلمانوں کو ایک قوم بناتا ہے اس لئے وہ ہر ملک کے
مسلمانوں کو اپنی قوم سمجھتے ہیں اور ان کی خوشی سے خوش اور ان کے رنج سے رنجیدہ
ہوتے ہیں اور اس لئے ہم کو اگر خدانخواستہ ترکوں کو نقصان پہنچے تو مثل قومی
نقصان کے رنج ہوگا گو وہ نقصان کسی پولیٹکل سبب ہی سے ہو۔"

نواب محسن الملک نے اس مسئلہ پر جو خیالات ظاہر کئے ہیں ان پر جنگ عظیم اور
مابعد کے واقعات کی روشنی ڈالکر غور کرنا چاہیئے۔

مصنوعات ملکی کی تحریک اور مسلمانوں کو تنبیہ

اگرچہ ہندوستان میں سُدیشی یا مصنوعات ملکی کی تحریک میں تقسیم بنگال سے
پیدا شدہ خیالات شامل تھے، تاہم اصل تحریک بے روزگاری کی مصیبت دُور کرنے اور
ترقی ملک کے لئے ضروری و مفید تھی، نواب محسن الملک کو اُن نقصانات کا جو ہندوستانی
صنعت و حرفت کی تباہی سے ملک کو پہونچے اور اُن فوائد کا جو اُس کے فروغ و ترقی سے
متیقن تھے پورا احساس و اندازہ تھا ان کی دقیقہ رس نظر اس اثر کو بھی دیکھ رہی تھی جو
مسلمانوں پر مترتب ہو رہا تھا اور مستقبل میں بدرجہا بُری طرح مترتب ہونے والا تھا، اسلئے
اُنھوں نے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں مصری اخبارات سے وہ مضامین شائع کرائے جن
میں یہی موضوع بحث تھا، پھر اکتوبر ۱۹۰۵ء کی اشاعت میں ایک بسیط مضمون شائع
کر کے خاص انداز میں مسلمانوں کو اس خطرہ سے متنبہ کیا جو ہندوستان کی سُدیشی تحریک
یا مصنوعات ملکی سے غفلت برتنے میں نظر آرہا ہے۔

نہیں کہا جا سکتا کہ اگر وقت مساعدت کرتا اور اُن کو کچھ موقع ملتا تو وہ اس تحریک کے متعلق کیا اصول کار اختیار کرتے اور مسلمانوں کو کس طور پر توجہ دلاتے، اس تنبیہ پر پورے تین سال گزر چکے لیکن آج بھی وہ غور و عمل کے قابل ہے بلکہ اُس زمانہ کے مقابلہ میں آج زیادہ ضرورت محسوس ہوتی ہے کیوں کہ مسلمان اُس خطرہ میں گھر گئے ہیں جس کا اس مضمون میں اشارہ ہے۔

سُدیشی تحریک

مسلمانوں کو سخت خطرہ کا اندیشہ

کئی مہینے سے ہندوستان میں جابجا یہ ہی چرچا ہے کہ اپنے ملک کی ساختہ پرداختہ چیزیں استعمال کی جانی چاہئیں، ہر شخص اپنے دل میں سوچتا ہے ہم کیوں ایسا عہد کریں، کیوں یورپین کارخانوں کی اشیاء جو سستی اور نفیس ہوتی ہیں چھوڑ دیں اور ہندوستانی کاریگروں یا اناڑیوں کی بنائی ہوئی مہنگی چیزیں خریدیں، لیکن ذرا غور و تامّل سے خود اس کی وجہ معلوم ہو جاتی ہے کسی ناصح یا مصلح سے رائے لینے کی ضرورت نہیں رہتی لکھو کھا ہندوستانی کارخانے بند ہو گئے اور روز بروز یکے بعد دیگرے اور بھی معدوم ہوتے جاتے ہیں یورپین اسباب کے درد کی سیل مواج کو کون روک سکتا ہے، کس کو مہارت ہے، کون مقدرت رکھتا ہے کہ اس کا مقابلہ کرے؟ ایسی ناقابلیت و عدم استعداد نے ہندوستان کے لوگوں سے سب کام چھوڑا دیئے جب پیشہ ور اپنے کام کو کھو بیٹھے اُن کے پاس نوکری چاکری ڈھونڈنے بغیر اور کچھ باقی نہ رہا اسی کی وجہ سے نوکریوں کا ملنا نہایت دشوار ہو گیا، ہر کس و ناکس تیلاش روزگار مارا مارا پھرتا ہی یک انار و صد بیمار کا قصہ ہے جن کو علم سیاست مدن سے واقفیت نہیں وہ اپنی بیکاری کا الزام سرکار پر لگاتے ہیں، لکھنے پڑھنے کے بعد وہ بزعم خود سرکار پر

حق رکھتے ہیں کہ خواہ نخواہ وہ اُن پر ملازمت کا دروازہ کھول دے، اوروں کے حقوق کو ان کی خاطر نہ دیکھے لیاقت و کاردانی کا لحاظ نہ رکھے، مگر دنیا کا قانون ہے کہ زبردست زیردست کو دبا لیتا ہے۔ قابل ناقابل پر غالب آتا ہے جو وقت کی مساعدت کرتا ہے وہ ہی دنیا میں زندہ رہ سکتا ہے پس ایسی حالت میں ہم کاروبار چھوڑ کر کیسے توقع رکھتے ہیں کہ ہم کبھی سرسبز ہو سکیں گے؟ بہبودی کی صرف یہی صورت ہے کہ ہم اپنا کام خود سنبھالیں اجنبیوں کو اپنا گھر بار سپرد نہ کریں اگر ہر فرد بشر کو اس طرف خیال آئے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہماری حالت متغیر نہ ہو جائے ہزاروں آدمی جو بیکار اور متلاشی پھرتے ہیں کام دھندے سے لگ جائیں ویرانے آباد ہو جائیں۔

اس زمانے میں ایشیائی بلاد کے معمور بازار اور بھری دوکانیں سب اصلی ویرانے ہیں، ان سے ملک کو فائدہ کیا نقصانات پہنچتے ہیں، دلی، قاہرہ، دمشق، قسطنطنیہ، طہران، وغیرہ سب بظاہر اسباب سے معمور اور آباد دکھلائی دیتے ہیں، لوگ وہاں کی دولت و رفاہیت کا راگ گاتے ہیں، ذرا سوچو کہ یہ بزازوں کی دوکانیں، یہ خوبصورت چینی کے برتنوں کے ڈھیر، یہ بساط خانے وغیرہ سب کے سب مٹی کے ڈھیر ہیں جو ہمارے چاندی، سونے کے عوض یورپین کارخانوں سے چلے آتے ہیں۔ ایشیائی لوگ محنت و مشقت سے پیسہ پیسہ کر کے جوڑتے ہیں اور اپنی کمائی کے وارث یورپین دوکان داروں کو بنا دیتے ہیں، یہ ایشیائی دکاندار جو یورپین اشیاء بیچتے ہیں بظاہر ہیں سوداگر معلوم ہوتے ہیں مگر درحقیقت یہ یورپ کے خیر خواہ اور نمک حلال کارندے ہیں اپنے وطن اور ہم وطنوں کا خون جگر پیتے ہیں اپنے ملک کی ترقی کو روکتے ہیں اپنے بھائی بندوں کے ہاتھ، پیر باندھ کر بیگانوں کے سپرد کرتے ہیں، ان کی دلی آزادی کو بڑھنے نہیں دیتے، ان کی دماغی روشنی کو بجھا دیتے ہیں، اگر تم کسی پر رونق بازار سے گذرو، ذرا غور کرو کہ بظاہری

نق کا تم پر کیا اثر پڑتا ہے، خبردار! دھوکہ نہ کھانا، یہ رونق اور یہ افراط، کساد
بازاری و قحط سے زیادہ مضر ہے، یہ تمہاری دانشمندی کا نتیجہ نہیں ہے، یورپ کے
کارخانہ دار اس تعریف کے مستحق ہیں۔ تم محنت کرو، اپنا عرق جبیں بہاؤ اور جو کما کر لاؤ
وہ فوراً یورپ کو بھیجدو، تمہارے ہم وطن دوکانوں پر دام تزویر بچھائے تمہیں لوٹنے
کو بیٹھے ہیں، جیسے مکڑی اپنے جالے میں غریب مکھی کو پھانس لیتی ہے ایسے ہی یہ
بیکاری اور صنعت و حرفت سے ناآشنائی تمہیں دام و آلام فلاکت میں پھنسائے
رہتی ہے۔ پس جو لوگ اپنے ملک کے، اپنے گھر کے، اور اپنی ذات کے بہی خواہ ہوں
اُنہیں آنکھیں کھولے مستعد رہنا اور قبل از وقت پیش آنے والی مصیبت سے بچنے کے
لئے کوششیں کرنی چاہئیں جب سمندر میں طوفان اُٹھتا ہے، ہوشیار ناخدا اپنی
کشتیوں کو تلاطم سے بچانے کی تدابیر سوچتا ہے اور غافل ملاح چشم بصیرت بند کئے
چلا جاتا ہے، موجیں اُسے گھیر لیتی ہیں اور سوائے ڈوب مرنے کے اور کوئی چارہ
اس کے ہاتھ نہیں رہتا مسلمانوں کی یہی کیفیت ہے۔ انقلاب وقت سے حکومت
نے اُن سے کنارہ کیا۔ دُنیا کے حالات بدل گئے مشرق کو چھوڑ مغرب سے حکومت کا
سورج نکلنے لگا، مگر بدنصیب منغفل مشرق ہی کی طرف طلوع الشمس سے اقتباس کرنے کے
منتظر بنے بیٹھے رہے اور اطراف سے کوئی تلاش نہ تھی۔ کوئی رخنہ یا کوئی کھڑکی کھلی
نہ تھی جس سے کلبۂ احزاں کے گلیم پوشوں کو معلوم ہوتا کہ سورج نکل آیا ہے، اور
نصف النہار کا وقت ہو چلا ہے، دُنیا نورانی اور فیض سے معمور ہے: آخر کار زوال
کا وقت ہوا، اُن کے دروازہ کی ریخوں میں سے روشنی پھوٹنے لگی، وہ سمجھے کہ صبح
ہو چلی ہے، ویسے ہی بستر نکبت و فلاکت پر پڑے انگڑائیاں لیتے رہے، جب کسی
پردسی نے جگایا دیکھا کہ دن ڈھل چکا ہے۔ اقبال مند لوگ اپنے کاروبار میں مصروف
ہیں اور بداقبالوں کے لئے گنجائش باقی نہیں ہے مسلمانوں نے اپنی سلطنت کھو کر،

اپنے علوم و فنون برباد کرکے جب آنکھیں کھولیں دیکھا کہ ان کے پڑوسی ہر جگہہ پھیلے پڑے ہیں۔ سرکاری نوکریوں کے لئے جو لیاقت مطلوب ہے۔ اُس میں ہر طرح کی فوقیت رکھتے ہیں اور ہر اعلی درجہ سے لے کر ادنی درجہ تک سب انہیں کے قبضۂ تصرف میں ہیں، سرکاری دفتروں میں مسلمان عام طور پر دفتری یا چپراسی کی خدمات کے سوائے اور کچھ نہیں پا سکتے۔ علمی ترقی کے لحاظ سے اب مسلمانوں اور ہندوؤں میں صدیوں کا فرق ہے اور کبھی ہم اُنہیں پکڑ نہیں سکتے۔ جیسے بڑے بڑے متبحر عالم اور فصیح و بلیغ مقرر روشن ضمیر حکما اب بیسیوں ہندوستان کی متقدم قوموں میں دکھلائی دیتے ہیں، مسلمانوں میں کہیں پائے نہیں جاتے؛ یہی کیفیت اور صیغوں کی بھی ہے جو خاص خاص پیشے اور صنعتیں مسلمانوں کے ہاتھ تھیں اُس میں بھی یہ لوگ گھُسے چلے آتے ہیں، ذرا تامل کرو! دیکھو چند سال پہلے چمڑے کا کام صرف مسلمانوں کے لئے مخصوص تھا، جوتہ فروش سب مسلمان تھے، اب انہیں شریف ہندو چمڑے کے کام میں مصروف اور ہندو جوتہ فروش بھی دکھلائی دیں گے۔ بساط خانہ کا کام اکثر مسلمان کرتے تھے اب ہندو اُس میں آ شریک ہوئے ہیں، جراحی کا کام زیادہ تر مسلمانوں کا تھا اب ہندو جراح دکھلائی دیتے ہیں اور مسلمان تلاش سے گنے جا سکتے ہیں، تقابل و مبارات کا بازار گرم ہے، اگر ہم وقت کو اپنا مساعد نہ بنائیں گے، کیسے فلاح پائیں گے؟ آج کل سودیشی تحریک اس زور شور سے پھیل رہی ہے اور مسلمان بدستور غافل ہیں، ہمیں سخت اندیشہ ہے کہ جو چند پیسے اُن کے ہاتھ میں وہ بھی اُن سے چھن جائیں گے۔

اب ہزارہا لائق لکھے پڑھے لوگ صنعت و حرفت کی طرف توجہ کرینگے مسلمان جُہلا کیا اُن کا مقابلہ کر سکیں گے؟ کہیں کہیں جو دوکانیں یا کارخانے مسلمانوں کے نظر پڑتے ہیں وہ اس مہلک سیلاب میں بلا شبہ بہہ جائیں گے! ہم نے اپنی پچھلی اشاعت میں ایک مصری اخبار کے مضمون "سیل جارف، فمن یقی المصریین خطرہ؟" (مہلک

سیلاب، مصریوں کو اس کے خطرہ سے کون بچا سکتا ہے ؟) کا ترجمہ شائع کیا تھا۔ اب ہم وہ ہی سوال اپنی قوم سے کرتے ہیں۔

سودیشی تحریک "مسلمانوں کو اس کے خطرہ سے کون بچا سکتا ہے" مسلمانوں کو سرکاری نوکری لیاقت و حصہ رسدی کے موافق ملے گی۔ زیادہ توقع رکھنا غلط خیال باندھنا اور جھوٹی امید لگانا ہے۔ اب ہر شخص کو صنعت و حرفت کی طرف ہی توجہ کرنی چاہئے۔ لازم ہے کہ طالب علموں کی جماعتیں امریکا و جاپان کام سیکھنے کے لئے کثرت سے جایا کریں، تاکہ واپسی پر بیرسٹروں کی طرح دوسروں کے محتاج اور دست نگر نہ رہیں بلکہ اپنی کاردانی سے ہزاروں کو فائدہ پہنچا سکیں، جاپان، ہندوستان سا سستا ملک ہے اور بہت کفایت سے وہاں ضروری تعلیم حاصل کی جاسکتی ہے۔

اِس ایک جواب کے سوائے اور کوئی بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ ہمارا مایوسانہ سوال کہ "سودیشی تحریک مسلمانوں کو اس کے خطرہ سے کون بچا سکتا ہے ؟" ہر وقت ہمارے دل کو گھیرے رہتا ہے۔ فرض کرلو کہ یہ تحریک کچھ عرصہ بعد ٹوٹ جائے تب بھی ہماری حالت اِسی خطرہ میں پڑی رہے گی، کیوں کہ بنگالیوں اور تعلیم یافتہ ہندوؤں کو نوکری سے نفرت پیدا ہو چلی ہے، اور دوکان داری سے موانست ہوتی جاتی ہے، بتلاؤ کہ تعلیم یافتہ دوکان داروں سے کس طرح پالا جیت سکیں گے ؟ جیسے اب ہم نوکریوں اور علمی کاموں میں پھسڈی ہیں ویسے ہی تجارت و صنعت و حرفت کے پیشوں میں ناکام رہیں گے، شاید آٹھ دس برس بعد ہی یہ نوبت آجائے گی کہ بازاروں میں سیکڑوں دوکانیں لکھے پڑھے لوگوں کی نظر آئیں گی، اُس وقت ہمارے لئے سخت مشکل ہوگی اور ہمیں اندر گھسنے کا موقع ہی نہ ملے گا ہم اس کو بڑی خوش نصیبی اور دانشمندی تصور کریں گے اگر اس "سودیشی" تحریک سے ہم فائدہ اُٹھائیں۔ اپنے دل و دماغ سے کام لیں، اپنے مال و دولت کو اس پر صرف کریں اور آیندہ اس کے نفع سے متمتع ہوں۔ اس سے مخالفت کا وہ ہی نتیجہ ہوگا جو

تعلیم مغربی سے متنفر ہو کر ہم نے حاصل کیا۔

"سودیشی" تحریک ہندوستان ہی میں محدود نہیں ہے، جن قوموں میں "قومیت" کا خیال پیدا ہوتا جاتا ہے اور اپنے زوال کی حالت دیکھکر متاسف ہوتی ہیں اور اجنبیوں کی مٹی اپنا چاندی، سونا دے کر نہیں خریدنا چاہتیں۔ چنانچہ حال ہی میں چینی لوگوں نے امریکہ کا اسباب خریدنا بند کر دیا اور اپنی ضرورت کے لئے خود اپنی کوشش سے سامان مہیّا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ ہی کیفیت جاپان کی ہے، غیر ممالک کی اشیاء وہاں نہیں جانے پاتیں ملک خود اپنے لیئے پیدا کرتا ہے اپنی دولت غیروں کو دے کر خود مفلس بننا نہیں چاہتا۔

انگلستان میں بھی عرصہ ہوا پارلیمنٹ نے بیرونی اشیاء کے خلاف قانون جاری کیا تھا جس کا منشا یہ ہی تھا کہ ملک کی صنعت و حرفت کو نقصان نہ پہنچے اور مفلسوں کی تعداد نہ بڑھے۔

اس مسئلہ کو حکومت و سیاست سے متعلق مت سمجھو، یہ تمدّن سے تعلق ہے جو لوگ اقوام متمدنہ میں رہنا چاہتے ہیں انہیں اس کی طرف داری کرنی چاہئیے اس کی حمایت بغیر سلامتی سے رہنا ممکن نہیں ہے مسلمان جو عرصہ سے قواعد و قوانین تمدن سے غافل رہ کر قسم قسم کے نقصانات اٹھا چکے ہیں انہیں اب قبل از وقت تیاری کرنی لازم ہے یہ بڑا سیلاب کچھ دور نہیں ہے چشم زدن میں آ پہنچے گا، ہم بزرگان قوم کو توجہ دلاتے ہیں وما علینا الا البلاغ"

نواب محسن الملک کی مشکلات

گذشتہ آٹھ سال (جنوری ۱۸۹۹ء تا جنوری ۱۹۰۶ء) میں ایم اے او کالج کو جو مالی استحکام ہوا اس کی مرکزیت اور وقعت و عظمت قائم ہوئی قوم میں بیداری اور

حیات جمہوری پیدا ہوئی اس کو سیاسی حقوق و مراعات ملے اور ایک خاص پولیٹیکل حیثیت تسلیم کرلی گئی وہ سب نواب محسن الملک کی بے ریا ہمدردی و دلسوزی بے نظیر قابلیت و تدابیر اور عدیم المثال سعی و انہاک کے مشکور نتائج تھے، لیکن ان کا یہ تمام زمانہ طرح طرح کی مشکلات و صعوبات سے معمور تھا۔ کبھی سکون و اطمینان کا ایک لمحہ بھی اُن کو نصیب نہ ہوا۔ اور ان کی زندگی کے آخری چند مہینے تو انتہائی تلخی و بے چینی میں گذرے۔

ایک ہی سال کے اندر کالج میں دیر رائل ہائینسز کی تشریف آوری و الطاف خسروانہ ہز مجسٹی امیر افغانستان کی رونق افروزی و اکرام و عنایات شاہانہ اور شملہ ڈیپوٹیشن کی کامیابی نواب محسن الملک کی شاندار کامیابیوں کی منتہا تھی، لیکن اندر ہی اندر جو ہوا وپک رہا تھا اور مشکلات کا جو جال بچھا ہوا تھا، اس کے لحاظ سے وہ انتہائی بے چین و مضطرب تھے، کبھی کبھی انسان کے دل پر مسرت و خوشی کے ہنگاموں میں رنج و غم کی ایک کیفیت طاری ہو جاتی ہے جو اگرچہ اس وقت بلا وجہ معلوم ہوتی ہے لیکن اکثر اس کا تعلق کسی نامعلوم پیش آیند سانحہ سے ہوتا ہے۔

نواب محسن الملک جب بادشاہ افغانستان کو رخصت کر رہے تھے تو اُن کا دل رنج و غم کی گہرائیوں میں ڈوب رہا تھا، اثنائے گفتگو میں ان دونوں شاہانہ تقریب کی عظمت و شان بیان کرتے ہوئے بے اختیار ان کی زبان سے یہ فقرہ نکلا کہ "معلوم نہیں اس کے بعد آیندہ کالج کا کیا حال ہوگا"

شاہ نے فرمایا کہ "وہ ہی حال ہوگا جو چاند کا بدر ہونے کے بعد ہوتا ہے"

چنانچہ ایک مہینہ بھی نہ گذرا تھا کہ شورش طلبا کا وہ سخت واقعہ پیش آیا جس کو ان تمام مشکلات کا نچوڑ کہنا چاہیئے لیکن قبل ازیں کہ اس واقعہ کا تذکرہ کیا جائے ان مشکلات پر ایک اجمالی نظر بھی ڈالنی چاہیئے۔

ایم اے او کالج کا اساسی مقصد

جس کالج کی خدمت میں یہ زمانہ گذرا اور جس کے ساتھ پوری قوم کی ترقی وابستہ تھی اس کا مقصد[1] اساسی انگریزوں سے سچی دوستی بے ریا اتحاد دوستانہ میں جول باہدگر ہمدردی سلطنت برطانیہ کی وفاداری اور اُس کے برکات کی قدردانی تھا۔

کالج فونڈیشن کی تقریب پر جو پبلک ڈنر ہوا تھا اس میں سرسید نے کہا تھا کہ "جب میری یہ چند روزہ عمر ختم ہو جائے گی میں آپ حضرات سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو چکوں گا اُس وقت بھی یہ کالج سرسبز رہے گا اور ہماری قوم کے نوجوانوں کو اس امر کی تعلیم دینے میں کامیابی حاصل کرتا رہیگا کہ وہ اپنے وطن کے ساتھ وہ ہی محبت سلطنت برطانیہ کے ساتھ وہ ہی وفاداری اُس کے برکات کی وہ ہی قدردانی اور افراد قوم حکمران کے ساتھ وہ ہی دوستی واخلاص قائم رکھیں جو تمام عمر میرے دل میں حکومت کرتا رہا ہے"[2]

اسی مقصد کے لئے سرسید نے انگلش اسٹاف کا انتخاب کیا جس سے اُن کو توقع تھی کہ وہ جماعت انتظامی کے ساتھ برادرانہ برتاؤ اور قوم کے بچّوں کے ساتھ پدرانہ شفقت رکھے گا ۱۸۸۹ء میں اسی کی طمانیت خاطر کے لئے سید محمود (مرحوم) کی جانشینی تسلیم کرائی گئی، قواعد وقانون میں بعض مخصوص دفعات رکھی گئیں اور حکومت کو مخصوص اختیارات دیئے گئے۔

مسٹر بیک نے ۱۸۸۲ء میں ہنٹر کمیشن کے دعوت کے موقع پر کہا تھا کہ "اس کالج کا پولیٹکل مقصد انگریزوں اور مسلمانوں کے درمیان اخلاص ومحبت کا قیام ہے، اس کالج میں رہنے سے یہ بات بخوبی ثابت ہو جاوے گی کہ دلی اختلاط اور باہمی عزت ومحبت کی زبردست فیلنگ کا قائم ہونا صرف ممکن ہی نہیں ہے وہ دونوں قوموں کے درمیان

---

[1] و [2] مدرسۃ العلوم پر تاریخانہ لکچر از سرسید۔

بن جول کا قدرتی نتیجہ ہے اور یہی فیلنگ ہے جس کو ترقی دینا اس کالج کا مقصود ہے اگر عمدہ فیلنگ قائم ہو جائے تو نہایت سخت طور کی پولیٹکل مشکلات رفع ہو جائیں گی "۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ انگریزوں کا ایک طبقہ مسلمانوں کے مدارس سے بھی بدظن تھا اور اس بدظنی سے محفوظ رہنے کا یہی بہترین اسلوب تھا کہ انگلش اسٹاف کو زیادہ دخیل رکھا جائے۔ چنانچہ سر چارلس الیٹ نے جو سول سروس کے ایک ممتاز رکن تھے اور بعد کو بنگال کے لفٹننٹ گورنر ہوئے۔ کالج ایسو سی ایشن لندن کے جلسہ منعقدہ جون ۱۹۰۸ء میں کالج کا ٹوسٹ تجویز کرتے ہوئے اس خیال کو یوں ظاہر کیا تھا کہ "بہت سے ملکوں میں اسلامی مدارس بغاوت اور فساد کے گھر ہیں مصر اور ٹرکی میں بھی یہی حال ہے، یہ حالت شکر کی بات ہے کہ کبھی علی گڑھ میں پیدا نہیں ہوئی شکر سر سید کی قابل تعریف مثال قائم کرنے اور ان لوگوں کی دانشمندانہ پالیسی کا ہے جو کالج کے انتظام سے متعلق تھے "۔

حصول مقصد سر سید کی زندگی میں یہ مقاصد بہ احسن وجوہ حاصل ہوتے رہے یہاں کے طلبا کی وفاداری مسلم ہو گئی، وہ قابلیت اور کیرکٹر میں ہندوستان کے بہترین اور انگلستان کی یونیورسٹیوں کے طلبا کی برابر شمار ہونے لگے۔ حکومت کے افسروں نے جن میں وائسراؤں سے حکام ضلع تک شامل ہیں اپنے اثر سے کالج کو بڑے بڑے فوائد پہنچائے اور سرکاری ملازمت میں اُسکے طلبا کو ترجیح دی گئی۔ اسی ادارہ سے کانگریس کا زور شور کم کرنے اور مسلمانوں کو اُس سے جدا اور اُس کے اثرات سے محفوظ رکھنے کے لیے بھی سخت کوششیں ہوئیں اور مسلمانوں کے دامن سے غداری و تعصب اور جہالت وغیرہ کے داغ مٹنے اور ہلکے ہونے شروع ہو گئے، کالج کے ہر ایڈریس میں مسلمانوں کی وفاداری کا یقین دلایا گیا اور ہر جواب میں اس کا اعتراف اور حوصلہ افزائی کی گئی۔

کالج کی پولیٹکل حیثیت

مشترک مقاصد کے لحاظ سے حکومت میں اسٹاف اور خاص کر پرنسپل کا اثر و رسوخ غیر معمولی طور پر بڑھ گیا اور ساتھ ہی اس کو انتظامات کالج میں حد سے زیادہ مداخلت اور جماعت ٹرسٹیان پر تفوق حاصل ہو گیا حتیٰ کہ جب سر سید کا انتقال ہوا۔ اس وقت کالج کی حیثیت بالکل ایک دیسی ریاست اور پرنسپل کی پوزیشن ایک برٹش رزیڈنٹ کی تھی۔

ریاستی دستور

ریاستوں میں دستور ہے کہ ایک فرمان روا کے انتقال کے بعد جب دوسرا رئیس مسند نشین ہوتا ہے تو وہ دربار میں تخت و تاج کے ساتھ عقیدت و وفاداری کا اعلان کرتا ہے اسی طرح یہاں بھی سید محمود لائف آنریری سکرٹری کے سامنے تجویز پیش کی گئی کہ :۔

"اسٹریچی ہال میں ایک میٹنگ کر کے جس میں کلکٹر و مجسٹریٹ ضلع اور دیگر مقامی یورپین اور ہندوستانی عہدہ دار شریک ہوں اس امر کا اعلان کیا جائے کہ سر سید کے انتقال سے کالج کے مقصد و مطمح نظر، طریق انتظام اور اس کے معاملات کی نگرانی اور پالیسی کے اصول میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی اور آپ کے سکرٹری ہونے سے ہماری غیر متزلزل اور دلی وفاداری میں جو حضور ملکہ معظمہ کے ساتھ ہے کچھ فرق نہ آئیگا جن کی فرماں روائی میں ہندوستانی مسلمان رعایا کو امن کی نعمت، بہتر حکومت اور روشن دماغی حاصل ہوئی اور ان چیزوں سے ہمارے دلوں میں وفاداری کی بنیاد قائم ہوگی جس کی آپ کے والد نے اپنے ہم مذہب اور اہل وطن لوگوں کی رائے سے نشو و نما کیا اور اُن کی یہ پالیسی تقریباً تمام روشن خیال مسلمانوں نے منظور کر لی"

(خط صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب مرحوم مورخہ ۸ اپریل ۱۸۹۸ء)

مسٹر بیک پرنسپل نے بھی لکھا کہ :۔

دو کلکٹر کی صدارت میں ایک جلسہ منعقد کیا جائے جس کا پہلا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ ٹرسٹیوں کی طرف سے عام اعلان کر دیا جائے کہ ہم سلطنت برطانیہ کے متعلق وہی پالیسی رکھیں گے جو سرسید کی تھی اور یہ کہ ہمارے کالج کا ابتدائی مقصد یہ ہے کہ ہم نوجوان مسلمانوں کو یہ تربیت دیں کہ علاوہ بذات خود وفادار ہونے کے وہ نہایت مستعدی کے ساتھ مسلمانوں میں وفاداری اور گورنمنٹ کی امداد کے جذبات مضبوط کریں گے" (خط مورخہ ۱۳ اپریل ۱۸۹۸ء)

سرسید کے بعد ایک سخت کشمکش

مگر بدقسمتی سے لائف آنریری سکرٹری (سید محمود) اور پرنسپل (مسٹر بیک) میں بہت جلد ناچاقی ہوگئی جس کے نتیجہ میں سکرٹری شپ کا بار نواب محسن الملک کے شانوں پر رکھا گیا لیکن عرصہ تک وہ اُس عہدے کے پورے اختیارات سے محروم رکھے گئے۔ مسٹر بیک نے اپنے اقتدار و اختیارات کو قانونی طور پر مستحکم و وسیع کرنے اور لائف پرنسپل بننے کے لئے مؤثر کوششیں شروع کیں ٹرسٹیوں میں متقابل پارٹیاں بن گئیں اور اسٹاف بھی فریقانہ حیثیت سے اُن کے نزاعات میں شامل ہوگیا۔

پرنسپل کا اقتدار

البتہ ستمبر ۱۸۹۹ء میں مسٹر بیک کی ناگہانی موت سے کچھ صورت حالات بدل گئی اُن کی جگہہ (سر) ماریسن صاحب کا انتخاب ہوا جو دہ سالہ ملازم اور سینیر پروفیسر تھے، سرسید ان کو نہایت عزیز رکھتے تھے طلبا پر ان کا خاص اثر تھا اور ان باہمی نزاعات سے وہ یک گونہ الگ تھے لیکن اُردو، ہندی کے قضئے میں ان کو سر انٹونی میکڈانل نے حکومت اور سکرٹری کے درمیان واسطہ بنا کر ان کا درجہ سکرٹری سے بالاتر کر دیا اور پھر لارڈ کرزن کی خاص عنایتوں نے امپیریل لیجسلیٹو کونسل کا عارضی ممبر نامزد کر کے متقدم جانشینوں کے مقابلہ میں اُن کا وقار و اقتدار زیادہ بڑھا دیا۔

اس اقتدار و اثر کا نتیجہ تھا کہ مسٹر ماریسن کے یہ بات ذہن نشین[51] ہو گئی کہ آنریری سکرٹری اسٹاف پر اپنا اثر نہیں ڈال سکتا اور نہ اُس کی نگرانی کر سکتا ہے۔

اسٹاف اور طلبا کے تعلقات جن اصولوں پر کالج قائم ہوا تھا اُن کے لحاظ سے سر سید نے نوجوان[52] مسٹر بیک (پرنسپل) اور اسٹاف کے بعض ممبروں کا براہ راست انگلستان سے انتخاب کیا تھا اور ان کو بورڈنگ ہاؤس کے انتظامات بھی سپرد کئے گئے تھے۔

ہنوز تین سال بھی اس انتظام کو نہ ہوئے تھے کہ ۱۸۸۰ء میں طلبا نے ایک معمولی واقعہ پر اسٹرائیک کی اور مسٹر بیک کے اخراج کا مطالبہ کیا لیکن نتیجہ میں دو طالبعلم[53] خارج کیے گئے اور شورش رفع ہو گئی۔

اب بورڈنگ ہاؤس حتیٰ کہ باورچی خانوں کا انتظام بھی کلیتًا اسٹاف کے قبضہ قدرت میں آگیا اور ہندوستانی کھانے کی عمدگی و خرابی ایک انگریز ممبر کی رائے پر منحصر ہو گئی نیز ذائقہ کی نسبت اسی کا فیصلہ مختتم ہو گیا۔

اسکے نتیجہ میں مسٹر بیک اور اسٹاف کے دیگر ممبروں اور طالب علموں میں نہایت عمدہ تعلقات ہو گئے۔ اور ۱۹۰۰ء میں جب ماریسن صاحب پرنسپل ہوئے تو طلبا کے ساتھ اُن کی مربیانہ شفقت ضرب المثل بن گئی، اُنھوں نے ایک سروس ایجنسی بھی قائم کی اور طلبا کی ملازمتوں اور ترقیوں کے لیے اپنا ذاتی و اخلاقی اثر استعمال کیا۔ اُن کی اس شفقت و محبّت کا شکر گزاری و احسان مندی کے ساتھ عام اعتراف تھا۔

---

[51] سرکلر لیٹر مسٹر ماریسن بنام ٹرسٹیان کالج ۱۹۰۴ء دربارہ تقرر مسٹر کارنا۔

[52] اس وقت مسٹر بیک بعض طلبا سے بھی کم عمر تھے۔

[53] مولوی عزیز مرزا بی اے۔ ہوم سکرٹری نظام گورنمنٹ و آنریری سکرٹری مسلم لیگ رحلت ۱۹۱۲ء
مولوی مظہر الحق ساکن دھلہ ضلع مظفر نگر پنشنر ڈپٹی کلکٹر۔

اسٹاف کے رویّہ کی تبدیلی اور اُس کا اثر

لیکن چند روز بعد بعض ایسے واقعات[۵۱] پیش آئے کہ اُن کے برتاؤ میں فرق آگیا، یونین کلب میں عربی اسکیم پر مباحثہ ہوا جس کے وہ سخت مؤید تھے طلبا نے مخالفت میں تقریریں کیں اور نتیجہ میں وہ پاس نہ ہو سکی، پھر دوسرے موقع پر اُن کی تائید سے یہ مضمون پیش ہوا کہ :-

"خلافتِ موجودہ اسلام میں کوئی چیز نہیں اور مسلمانانِ ہند سلطنت برطانیہ کی رعایا ہو کر کسی دیگر سلطنت کے فرماں روا کو خلیفہ نہیں مان سکتے۔"

اس پر بڑی گرم بحثیں ہوئیں اور تجویز مسترد ہو گئی۔ اس دور کے واقعات میں ایک اہم واقعہ یہ بھی تھا[۵۲] کہ چند نوجوان طلبا ایک انگریز نوجوان مشنری خاتون سے بائبل پڑھنے جاتے تھے، اِس ذوقِ علم کو اکثر اصحاب نے خطرناک سمجھا، نواب محسن الملک نے سختی سے مخالفت کی جس کا اثر یہ[۵۳] ہوا کہ مارین صاحب طلبا سے اسقدر کشیدہ ہو گئے کہ اُن کو اپنی کوٹھی پر آنے سے منع کر دیا۔

اُن کی اس متبدلہ کیفیت کا اثر اسٹاف کی طبائع پر بھی پڑا اور بعض ممبروں نے طلبا کے ساتھ توہین آمیز رویہ اختیار کر لیا۔

اُن کے خاص آورده مسٹر کارنا کے غیر شریفانہ برتاؤ اور بعض گفتگوؤں سے زیادہ ناراضی پھیلی، غرض زیادہ ذہین اور سینیئر طلبا جن میں خودداری کا زیادہ احساس تھا اب زیادہ شاکی و ناراض تھے۔

اساتذہ کو بھی طلبا سے سوءِ ادب اور تمرّد کی شکایات تھیں اور اس مشرقی ادب

---

۵۱ مرقعِ کالج مرتبہ مولوی بدرالدین بی اے۔ ایل ایل بی۔ مرادآباد۔

۵۲ "البشیر" اٹاوہ۔

۵۳ سرکلر لیٹر نواب وقار الملک۔ موسومہ ٹرسٹیان کالج۔

کے فقدان پر جو پچھلی صدی کے طلبا میں پایا جاتا تھا ان کا غصہ تیز ہو جاتا تھا۔

۱۹۰۴ء سے ان واقعات و حالات کے متعلق اخبارات میں سلسلہ شکایات شروع ہو گیا تھا۔ اسٹاف اور ٹرسٹیوں دونوں پر شدید اعتراضات ہوتے تھے اور اندرونی خرابیوں کو بڑھا چڑھا کر دکھایا جاتا تھا۔

مسٹر ماریسن اور آنریری سکرٹری میں عربی اسکیم کے متعلق شدید اختلاف ہوا جو آخر کار کچھ ترمیم کے ساتھ نواب محسن الملک کی رائے کے مطابق طے ہو گیا۔ اس کے بعد ہی باوجودیکہ ہنوز کالج مالی مشکلات میں تھا مسٹر ماریسن نے انگلش اسٹاف کے سالانہ اضافہ کی ایک اسکیم پیش کر دی اور متنبہ کیا کہ :۔

"اگر یہ اسکیم اس وقت منظور نہ کی گئی تو میرا گمان غالب ہے کہ آئندہ موقع پر ٹرسٹی اس سے وسیع شرائط منظور کرنے پر مجبور ہوں گے"[51]

اس کے ساتھ ہی اسسٹنٹ اسٹاف کی اسکیم بھی پیش ہو گئی۔

ہنوز یہ مسئلہ زیر غور تھا کہ مسٹر ماریسن نے جو عنقریب سبکدوش ہونے والے تھے مسٹر آرنلڈ کو اپنا جانشین بنانے کی انتہائی کوشش کی اور اس مقصد کے لئے ٹرسٹیوں کو گشتی چٹھی بھیجی اور بعض ایسی کارروائیاں بھی کیں جو اُن کے مرتبہ سے گری ہوئی تھیں نواب محسن الملک کو ان کے اصرار کی نامنظوری سے مختلف اندیشے تھے، لیکن نواب وقار الملک نے بعض ٹرسٹیوں کی تائید حاصل کر کے سخت اختلاف کیا۔

مسٹر ماریسن کے رویہ کی اس تبدیلی سے بڑے خطرات پیدا ہو گئے تھے نواب وقار الملک نے تو ایک خط[52] میں یہاں تک لکھا تھا کہ :۔

---

۵۱ روئداد ہائے اجلاس ٹرسٹیان ۱۹۰۴ و ۱۹۰۵ء۔

۵۲ ملاحظہ ہو نواب وقار الملک کا سرکلر لیٹر موسومہ ٹرسٹیان کالج اگست ۱۹۰۵ء و خط موسومہ مولانا حالی (مکاتیب حصہ دوم)

"اب جو دن مسٹر ماریسن کے تشریف لے جانے کے باقی ہیں خدا کرے وہ خیر و عافیت سے بسر ہو جائیں اور شکریوں کے نعروں ہی میں رخصت ہوں ورنہ بہت اندیشہ ہے کہ آیندہ اس پانچ چھ مہینہ کی مدت میں وہ واقعات پیش نہ آجائیں جس سے علانیہ کشمکش پیدا ہو جائے اور بے لطفی ترقی کر جائے"

مسٹر ماریسن کی سبکدوشی بالآخر پندرہ سال کے بعد مسٹر ماریسن[۱] مارچ ۱۹۰۵ء میں سبکدوش ہوئے ان کی خدمات و احسانات کے اعتراف میں ایڈریس اور ہدیے پیش کئے گئے۔

---

[۱] مسٹر ماریسن پروفیسر کی علمی حیثیت سے نہایت ممتاز تھے ان کو سرسید کے زمانہ سے بورڈنگ لائف میں گہری دلچسپی تھی۔ سرسید نے ان کی ایک تقریر کا ترجمہ اسٹریچی ہال کے دروازہ پر کندہ کرایا، انہوں نے جو جدید تقرر کے وقت پانچ سال خدمت کرنے کی شرط کرلی تھی اور جب وہ وقت پورا ہوا تو سبکدوشی چاہی، پرنسپلی کے زمانہ میں ڈسپلن کے متعلق سختی کی۔ مردانہ کھیلوں میں ورزش جسمانی اور خاص کرفٹ بال کو ترقی دی۔ رائڈنگ اسکول اور انگلش ہاؤس قائم کیا۔ فنانس کمیٹی کے سکرٹری کی حیثیت سے حسابات کی درستی پر خاص توجہ کی، کالج کی تمام سوسائٹیوں میں شرکت کرتے رہے۔ طلبا کی مذہبی تعلیم اور ان سے مذہبی فرائض کی پابندی کا زبردست خیال رہا۔ مدرس ایجنسی قائم کر کے مختلف صوبوں میں بہت سے طلبا کو ماموں کرایا۔ مسز ماریسن بھی بچوں پر بہت شفیق تھیں اور ان کی تعلیم و تربیت کی نگرانی کرتی تھیں زنانہ اسکول کے قیام کی تحریک کی اور رسالہ خاتون کے لئے مضامین بھی لکھے۔ سر تھیوڈور ماریسن کا نام ہماری قوم کی جدید تاریخ میں جہاں احترام و شکر گزاری کے ساتھ بار بار آئیگا وہاں یہ واقعہ بھی ثبت رہیگا کہ انہوں نے مسٹر کارنا اور مسٹر براون کے انتخاب میں غلطی کی اور ان نتایج پر غور نہیں کیا جو مسلسل طور پر سامنے آرہے تھے، حکومت میں کالج کی بدولت جو اقتدار ان کو حاصل تھا اس کا مسلمانوں کے (بقیہ صفحہ ۲۰۷ پر)

اور اُنہیں کالج کا وزیٹر بنایا گیا۔ نواب محسن الملک نے ٹرسٹیوں کی جانب سے اُنکی کوششوں اور ہمدردیوں اور اشتراک عمل و متابعت احکام کا بہتر سے بہتر پیرایہ میں اظہار تشکر کیا جو ایک تحریر پاسند کی صورت میں دیا گیا۔ اس تحریر میں بورڈنگ ہاؤس اور ڈسپلن کے تذکرہ میں ایک خاص جملہ یہ بھی تھا کہ :۔

"یہ ہم نہیں کہتے کہ جو اخلاقی اثر لڑکوں پر ہونا چاہئے وہ پورا حاصل ہوا ہے مگر اس کے وہ اسباب تھے جو آپ کے اختیار سے خارج تھے اور اس میں آیندہ زیادہ اصلاح کی ضرورت ہے۔"

مسٹر ماریسن کی رخصتی تقریر مسٹر ماریسن نے جو رخصتی تقریر کی اس میں سرسید اور اسٹاف کے خوشگوار تعلقات کا تذکرہ کر کے موجودہ زمانہ کی خوشگواریوں اور بعض امور کی نسبت کہا کہ :۔

"ہم سب جانتے ہیں کہ سرسید کو اس بات پر کیسا اصرار تھا کہ یہ کالج اور وہ تحریک جس کی یہ کالج ایک صورت ہے مسلمانوں اور انگریزوں کی دوستی پر مبنی ہیں۔ اگرچہ ضرور تھا کہ ایک روز افزوں ترقی کرنے والے انسٹی ٹیوشن میں بہت سی چیزیں بدل جاتی ہیں لیکن سرسید کی پالیسی کا یہ سنگ بنیاد ہنوز قائم ہے۔ نئے نئے ٹرسٹی جماعت انتظامی میں شامل ہو گئے اور نئے نئے انگریز اسٹاف میں آ گئے ہیں لیکن ان کے عمدہ تعلقات بدستور جاری ہیں۔ حضرات آپ مجھے اجازت دیجئے گا اور نواب صاحب آپ اپنی موجودگی میں مجھے اس کہنے پر معاف فرمائیگا کہ سرتاپا اس تعریف کا مستحق آنریری سکرٹری یعنی

(گزشتہ سے پیوستہ) اصولی مفاد میں صحیح استعمال نہیں کیا اور اسی کے زعم میں اپنی پالیسی قائم رکھنی چاہیے جو بہت ہی صورتوں میں مسلمانوں کی قومی پالیسی اور روحانیت کے متناقض تھی جس کا خمیازہ اُن کے جانشین کے زمانہ میں نکلا۔

نائب ٹرسٹیان ہے کہ جنہوں نے اسٹاف کے ساتھ ہمیشہ دوستی- اخلاق اور
پاس مرتبت کا برتاؤ ملحوظ رکھا۔

حضرات مجھے تھوڑی دیر تک اس اہم خدمت کے بیان کی اجازت
دیجئے جو نواب صاحب نے کالج کے لئے سرانجام دی اور جس سے دنیا تقریبًا
بے خبر محض ہے۔ کہنے کو تو یہ کہدینا نہایت آسان ہے کہ ہم سرسید کی روش
کو بحال رکھتے اور مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان دلی دوستی چاہتے ہیں
لیکن کارفرما کی نازک حیثیت میں یوں کام لینا کہ دوستی میں سرمو فرق نہ آئے
بہت مشکل ہے۔ موٹے لفظوں میں یوں کہنا چاہئے کہ کارفرما اور کارکن کے
درمیان ایک قدرتی تخالف واقع ہوا ہے۔

ایسے معاملوں میں جیسے کہ تنخواہ و ترقی رخصت اور دیگر حقوق میں اختلاف
رائے طبعًا ناگزیر ہے نہ گورنمنٹ کے محکمے اس سے بری ہیں نہ عوام کے کارخانے
مگر باوجود اس کے کہ یہ مشکلات نواب محسن الملک کے منصب کی سرشت میں
میں داخل ہیں اس پر بھی وہ نہ صرف تمام اسٹاف کی سچی دوستی کے حاصل
کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں بلکہ اُنہوں نے ان کو اسلامی ترقی کی کوشش
میں رفیق راہ بنا لیا ہے۔ بڑے انتظار کے بعد مجھ کو یہ موقع ملا ہے کہ اُن کی
گوناگوں عنایتوں اور مروّتوں کا جو وہ میری نسبت ہمیشہ ظاہر فرماتے رہے
علی الاعلان شکریہ ادا کروں یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ ان کے ساتھ کام کرنے
میں مجھے ہمیشہ خوشی حاصل ہوتی رہی اور اختلاف رائے نے کبھی ہماری دوستی
میں فرق نہ آنے دیا مجھے خوب معلوم ہے کہ آنریری سکرٹری اور پرنسپل
کے درمیان مسلسل یگانگت پر بعض لوگوں کو ناموافق نکتہ چینیوں کا موقع ملا ہے
مگر یہ نکتہ چینی صرف انہیں لوگوں تک محدود تھی جن کو اس بات کا علم نہیں

کہ پچھلے پانچ برس میں کالج کا اصل انتظام کیوں کر چلتا رہا، اس میں شک نہیں کہ مشکلات پیش آئیں اور اختلاف رائے نے بعض اوقات صورت دکھائی لیکن پبلک میں کبھی ان باتوں پر ردوکد نہ ہوئی۔ پرائیویٹ طور پر میرے اور نواب صاحب کے درمیان اکثر ان باتوں پر طولانی اور پرجوش گفتگوئیں ہوئیں لیکن قبل اس کے کہ وہ پبلک کے کانوں تک پہونچیں اور تصفیہ باہمی مشکل اور اپنی بات سے ہٹنا ناممکن ہوجاتا ہم ہمیشہ ان کا فیصلہ کر لیتے تھے نواب صاحب میں بھی سرسید کی خوشگوار خصلت یعنی اپنی تعریف دوسروں سے منسوب کر دینے کی عادت پائی جاتی ہے۔ حضرات مجھے اس کہنے کی اجازت دیجیے کہ آج آپ کے ایڈریس میں اس کی بہت سی جھلکیں نظر آتی ہیں کیونکہ آپ نے اکثر باتیں جن کی تعریف کے اصلی مستحق نواب صاحب تھے مجھ سے منسوب کی ہیں اگر کوئی بات ایسی ہے جس میں نواب صاحب نے سرسید کے طریق عمل کو چھوڑا ہے تو وہ سلیقہ کاروبار کے معاملات میں ماہرین سے استصواب کرنے کا عزم ہے۔ مثلاً خود نواب صاحب ہی نے حساب پیشہ ماہرین کے ذریعہ سے کالج کے حسابات کی سالانہ جانچ پڑتال ہونے پر زور دیا تھا اور میسرز لیولاک اینڈ لیوس کے استادانہ مشورہ ایسے نتیجہ خیز ثابت ہوئے ہیں کہ اس وقت کالج میں ایک شخص بھی ایسا نہیں ہے جس کی رائے نواب صاحب کی رائے نہ ہو۔ لیکن اگر میں نواب صاحب کی تدبیر اور دوراندیشی کی ساری مثالیں جن کے لئے یہ کالج ان کا ممنون ہے گننے لگوں تو آپ صاحبوں کو بہت دیر ٹھہرنا پڑے گا اس لئے میں صرف اس بات کو بہ تکرار کہنا چاہتا ہوں کہ اُن کے دوستانہ سلوک اور اخلاق نے ان کے ساتھ مل کر کام کرنے کو ہم سب کے لئے باعث مسرت بنا دیا ہے۔ میں ان شخصی اوصاف پر بار بار اس لئے زور دیتا ہوں کہ گزشتہ چند سال

کی کامیابی کو میں از روے انصاف ضابطۂ موضوعہ (یعنی قواعد و قوانین ٹرسٹیان) سے منسوب نہیں کرسکتا۔ اگر کوئی کام مقابلۃً ایسا ہی ہے کہ جسے ناتمام چھوڑنے کا مجھ کو رنج ہے تو وہ قواعد و قوانین کو از سرِ نو ترتیب دینا ہے، عامۂ خلائق کو کبھی معلوم نہو گا کہ اس ناقص ضابطہ کی وجہ سے کس قدر مفید کام رُکا رہا اور کیسے کیسے موقع اور کٹھن صورتیں فقط نواب محسن الملک کی کارگزاری، قوت برداشت اور استقلال سے حل ہوئیں۔ اگر یہ ضابطہ بہت جلد ترمیم نہ ہوا تو مجھے آیندہ کے لئے سخت اندیشہ ہے۔

ٹرسٹیوں اور اسٹاف کے باہم خراش کا باعث کوئی چیز ان غیر واضح اور غیر ممکن التعمیل قواعد سے بڑھ کر نہیں ہوسکتی جو کالج کا ضابطہ اصول ہیں ایسی صورتیں اکثر پیش آتی رہیں کہ اگر قواعد مذکورہ کی لفظی پابندی کی جاتی تو کالج کا کاروبار ایک دم سے رُک جاتا۔"

اس کے بعد انھوں نے قواعد و ضوابط کالج کی ترمیم پر خاص طور سے توجہ دلائی اور سنڈیکیٹ بنانے پر زور دیا جو ٹرسٹیوں کی طرف سے اگزکٹو کمیٹی کے طور پر کام کرے۔

جدید پرنسپل مسٹر ماریسن کے بعد مسٹر کارنا[۵۱] قائم مقام ہوئے لیکن لندن میں مسٹر ڈبلو، اے، جے، آرچبولڈ۔ ایم، اے۔ ایل، ایل، بی کا انتخاب[۵۲] کیا گیا جو ایک علم دوست مصنف اور تعلیم و تعلّم کے زیادہ شائق تھے اور اُن سے بڑی اُمیدیں وابستہ تھیں وسط اکتوبر ۱۹۰۵ء میں ہندوستان آکر انھوں سے

---

[۵۱] جولائی میں مستعفی ہوگئے۔

[۵۲] سید امیر علی، میجر سید حسن اور دیگر ہمدردانِ کالج نے انتخاب کیا تھا وہ اُسوقت انڈین سول سروس بورڈ آف اسٹڈیز کے سکریٹری تھے اور اس سے قبل جنوبی افریقہ میں صلاح و قانونی اسر سے کہ مشورہ ۔۔۔ بھیجے گئے تھے۔

اپنی خدمات کا جائزہ لیا۔

طلبار اور اسٹاف کو فہمائش

نواب صاحب کو طلبار کی حالت اور اسٹاف کے رویّہ کی تبدیلی کا اندازہ و احساس تھا اور اب پہلے موقع پر جب کہ مسٹر آرچبولڈ کو آئے ہوئے چار ہی مہینہ گذرے تھے کہ ۸ر مارچ کو ویرائل ہائینس کی رخصت سے دن شب کو ایک ڈنر ہوا جس میں اولڈ بوائز معزز مہمان اور طلبائے کالج شریک تھے۔ یہ قدرتی موقع تقریروں کا تھا نواب صاحب نے اپنی ایک تقریر میں طلبار کو نصیحتیں کیں۔

مسٹر آرچبولڈ نے بھی ایک تقریر کی جس میں کالج کے اسٹاف اور ٹرسٹیوں سے باہمی اتحاد اور دوستانہ تعلقات کی ضرورت پر زور دیکر کہا کہ "جب کسی قسم کا اختلاف پیدا ہو تو کامل اعتماد اسٹاف پر ہونا چاہئے" اُنھوں نے یہ بھی یقین دلایا کہ وہ اپنے پیشرووں کی طرح مسلمانوں کی بہبودی اور کالج کی ترقی میں کوشاں رہیں گے۔

اس کے جواب میں نواب محسن الملک نے ایک بسیط تقریر کی جس میں انھوں نے کہا کہ "ہمارے کالج کی ترقی اس کا استحکام اس کی بہبودی اور اس کی تکمیل اس پر منحصر ہے کہ ہمارے کالج کا اسٹاف اوّل درجہ کا ہو اور نہ صرف علمی قابلیت کے لحاظ سے بلکہ خاندانی اور اخلاق اور اخلاص کے خیال سے ایسا ہو جو اپنے فرائض کو صرف تعلیم دینے پر محدود نہ رکھے بلکہ اس خیال سے کہ وہ ایک ایسے قومی کالج میں کام کرنے کے لئے آیا ہے جس کو انگریزوں کی مدد اور اُن کے اخلاقی اثر اور تربیت اور نگرانی کی نہایت ضرورت ہے وہ مثل اپنی قوم کے ہمارے بچّوں کو اپنا سمجھے اور اُن کی اخلاقی حالت کے درست کرنے کو اپنا دل خوش کُن اور ضروری فرض سمجھے۔ ہمارے ساتھ دوستانہ برتاؤ رکھے اور مسلمانوں اور انگریزوں میں ارتباط اور اتحاد بڑھانے کی کوشش کرے۔ کیوں کہ ہندوستان میں اسی بات کی اس وقت ضرورت ہے اور

مسلمانوں کی بہبودی اور آیندہ کی ترقی اسی پر منحصر ہے" پھر سابق پرنسپلوں وغیرہ کی کوششوں برتاؤ ہمدردیوں، نیکیوں اور اخلاق وغیرہ کا ذکر کرکے ان امیدوں کا اظہار کیا جو مسٹر آرچبولڈ اور اسٹاف سے تھیں، لیکن یہ بھی جتا دیا کہ ان کو ہمیشہ اس کا خیال رکھنا چاہئے، کہ وہ تعلقات جو ہمارے اور اُن کے باہم ہیں اُن میں اپنے اپنے فرائض ادا کرنے کے خیال سے کبھی کبھی رائے کا اختلاف ضرور ہوگا اور ہم اپنے فوائد اور مقاصد کو ہمیشہ پیش نظر رکھنے کی وجہ سے اُن کے کاموں کو دیکھتے رہیں گے ہماری جماعت ایک گورننگ باڈی ہے، اور کالج کے اصول اور ترقی کی تجویزیں زیادہ تر ہم سے متعلق ہیں ہم کبھی اُن کو نہیں چھوڑ سکتے۔ اور اگر اُس میں کسی قسم کی مدارات یا مداہنت کریں تو ہم خدا اور قوم کے روبرو گنہگار ہوں گے اور وہ بھی خوب جانتے ہیں کہ ہمارے ٹرسٹیوں کی جماعت اپنے فرائض کو خوب سمجھتی ہے، کالج کی نگرانی اور کالج اسٹاف کے کاموں پر نظر رکھنا ہمارا کام ہے، ہماری جماعت تعلیم یافتہ اور تربیت یافتہ مسلمانوں کی جماعت ہے، بعض دیگر انسٹی ٹیوشنوں کی طرح وہ صرف برائے نام نہیں ہے نہ آمین گوئی اور خوشامد اس کا شعار ہے، وہ ان تمام باتوں میں جو کالج سے متعلق ہیں اپنے فرائض اور حقوق کا خیال رکھتی ہے اور رکھے گی اور چوں کہ یہ ایک ایسا کالج ہے کہ جس پر تمام ہندوستان کے مسلمانوں کی نظر ہے اور اُس نے تمام ہندوستان کے مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کا ذمہ لیا ہے اس کے مقاصد نہایت عظیم ہیں اور ان کے حاصل کرنے میں لگاتار کوشش کرنا اُس کا فرض ہے ایسی حالت میں اختلاف رائے کا ہونا ضروری ہے اور جیسا کہ میں نے کئی مرتبہ اپنے معزز دوست مسٹر آرچبولڈ سے کہا ہے، ہم ان کی رایوں کو بہت خوشی سے سنیں گے اور اُس پر غور کریں گے اور اُن کی قدر و منزلت کریں گے، مفید نہ سمجھینگے اُن سے اختلاف کریں گے اور آخری فیصلہ جو ہمارا ہوگا اُس پر نیک دلی سے عمل کرنا

ان کا فرض ہو گا اور مجھے اُمید ہے کہ ہمارے معزز پرنسپل اور دیگر یورپین بھی اس کو تسلیم کریں گے اور کسی اختلاف کو نیک نیتی کے سوا کسی اور بات پر محمول نہ کریں گے "

ٹرسٹیز کی حالت

۱۸۸۹ء کے قانون سے انتظامات کی آخری ذمہ داری نشتر ٹرسٹیوں پر تھی جو حین حیاتی ہوتے تھے، چوں کہ کالج کا ٹرسٹی ہونا اُس وقت قوم میں سبب عزت اور حکام میں ذریعہ رسوخ تھا اس لئے متعدد ٹرسٹی نہ صرف ایک ایک خاندان سے بلکہ ایک ایک گھر سے منتخب ہو جاتے تھے اور اس نشتر کی تعداد میں زیادہ تر امرا، سرکاری عہدہ دار اور کم تر آزاد پیشہ اصحاب تھے۔ ۱۸۹۸ء تک کالج کا دائرۂ اثر بہت محدود تھا اس لئے ان کا انتخاب بھی زیادہ تر صوبہ متحدہ و پنجاب سے ہوتا تھا، چنانچہ اوّل الذکر صوبہ کے ۵۴ اور آخر الذکر کے ۲۰ اور باقی پانچ بنگال و بہار بمبئی اور وسط ہند کے تھے۔

اسی شورش کے زمانہ میں مولانا حالی لکھتے ہیں کہ "دیکھئے ٹرسٹیوں کی بھرتی درحقیقت سر سید کے وقت میں شروع ہوئی تھی، اُنھوں نے کالج کی وقعت بڑھانے کے لئے اور نیز اس لئے کہ اُن کے دُور اندیشانہ منصوبے بغیر کسی اختلاف کے پورے ہوتے رہیں گے ایسے لوگوں کو کالج فنڈ کمیٹی کا ممبر بنایا تھا جن سے مالی امداد کی توقع ہو یا جو قوم میں کسی وجہ سے شہرت رکھتے ہوں اور سکرٹری سے کسی معاملہ میں اختلاف کرنے کا نہ اُن میں مادہ ہو اور نہ ارادہ پھر جب ٹرسٹی بل پاس ہوا تو وہی لوگ ٹرسٹی مقرر کئے گئے اور آج تک اسی اصول پر ٹرسٹیوں کا انتخاب ہوتا رہا (مجموعہ خطوط حالی صفحہ ۲۷ حصّہ اوّل)

نواب محسن الملک کی مایوسی

نواب محسن الملک جب جانشین ہوئے تو جہاں تک اُن کی ذات پر اعتماد کا تعلق تھا، ٹرسٹیوں نے اُس کو ظاہر کیا اور قائم رکھا لیکن فرض شناسی کے موقع پر اُنکو نہ صرف مایوسی ہوئی بلکہ تکالیف اُٹھانی پڑیں ۱۹۰۶ء تا ۱۹۰۴ء کے ان حالات کا خود نواب محسن الملک

کے خطوط میں مطالعہ کرنا چاہیے۔

(۱) میں بہت خستہ ہو گیا ہوں اور اب محنت اور تکلیف اٹھانے کے آثار معلوم ہوتے ہیں مگر اب بھی اس قدر کام ہے کہ آرام لینے کے لئے میں بمبئی بھی نہیں جا سکتا اجلاس ٹرسٹیوں کا ہو گیا جس نے بھٹیار خانہ کا شور وغل دیکھا ہو گا اس کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ یہ مجلس اس سے بہت بڑھی ہوئی تھی ایسا شور وغل ہوا اور ایسی بے تہذیبی اور بیہودہ تکرار اور پارٹی فیلنگ کی کارروائی جس کو دیکھکر نہایت شرم آئی۔ مولوی عبدالماجد کے تقرر کی تحریک پیش تھی، صرف حبیب[۱] الرحمٰن خاں کی مخالفت کی وجہ سے ان کے اقارب نے اختلاف کیا اور نہایت بے ضابطہ و ناجائز ووٹ پاس کئے یعنی جن ٹرسٹیوں نے کسی قسم کی کوئی رائے نہ دی تھی اور ہمیشہ ایسے ووٹ خارج سمجھے جاتے تھے، اس کی نسبت علیہ آرا سے یہ رزولیوشن پاس ہوا کہ جو ووٹ خالی ہوں اور اُن پر منظوری یا نامنظوری کی کوئی رائے نہ دی گئی ہو وہ نامنظوری میں شمار کئے جائیں تاکہ نامنظوری کے ووٹوں کی تعداد زیادہ ہو جائے اِس بحث کی نوبت تکرار تک پہونچی اور آفتاب احمد خاں صاحب اور حبیب الرحمٰن خاں صاحب جلسہ سے اُٹھکر چلے گئے اور صرف اسی ناجائز فیصلہ سے مولوی عبدالماجد صاحب کا تقرر نامنظور ہوا۔

مولوی صاحب قوم کی نہایت افسوسناک حالت ہے، ساری کوششیں بے سود ہیں جو لوگ قومی کام میں وقت صرف کرتے ہیں وہ صرف اپنی عادت سے مجبور ہیں ورنہ قوم پر کوئی نمایاں اثر نہیں ہوتا، افسوس ہے کہ آپ بضرورت تشریف لے گئے اور جلسہ میں شریک نہ ہو سکے ورنہ ایسی کارروائی نہ ہوتی۔"

(۲) میری طبیعت قریباً بدستور ہے آثار مرض کم ہو گئے ہیں نہ ہر یلا مادہ جو پیدا ہو گیا تھا وہ بھی جا رہا ہے مگر ضعف بدستور ہے اور طبیعت کی پستی قائم ہے کام

---

[۱] نواب صدر یار جنگ رئیس حبیب گنج ضلع علی گڑھ۔

تو کچھ ہو نہیں سکتا اور آج کل کام کی وہ کثرت ہے کہ رات دن اُس کے لئے کافی نہیں، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ پرنس[۵۱] کی وزٹ کا کیا انجام ہوگا اور اس کا کیا انتظام ہوگا اور روپیہ کہاں سے آئیگا۔

اسی طرح کانفرنس کا حشر بھی معلوم نہیں کہ کیا ہوگا۔ علی گڑھ سے جو خبریں آئی ہیں وہ یہ ہیں کہ کوئی کام کرنے والا نہیں ہے اور کچھ کام نہیں ہوا کمیٹیوں کی تاریخیں مقرر ہوتی ہیں اور کورم پورا نہ ہونے کی وجہ سے کارروائی نہیں ہوتی یہ حالت تو ان کاموں کی ہے جن میں کسی کا خوف اور اندیشہ نہیں ہے اس کام کی کیا امید ہو سکتی ہے جس میں حکام کی نارضامندی کا خیالی اندیشہ ہو ہم لوگوں کی حماقت ہے جو آرام چھوڑ کر قومی کاموں کے خبط میں گرفتار رہیں۔"

تاہم بعض پرانے اور نئے ٹرسٹی ایسے بھی تھے جو ان مایوسیوں اور مشکلوں میں سہارا دیتے اور ہمت بندھاتے مگر اکثریت حوصلہ شکن تھی

اولڈ بوائز کی باہمی عداوت اور اسکا اثر

قدرتی طور پر کالج کے استحکام اور اُس کی آیندہ ترقی کی اُمیدیں اُس کے فرزندان علی کی ہمت وخدمت اور ہمدردی و دل سوزی سے وابستہ تھیں اسی لئے قانون ٹرسٹیاں وضع ہوتے ہی چند نوجوانوں کو ٹرسٹیز کمیٹی اور اسٹاف کے زمرہ[۵۲] میں منتخب و داخل کیا گیا۔

۱۸۹۲ء میں اُنہوں نے آپس کی برادرانہ محبت اور کالج کی امداد کے خیال سے برادرہڈ (اخوان الصفا) قائم کی جو ۱۸۹۹ء میں اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کی باقاعدہ صورت میں تبدیل ہوگئی۔

اب علی گڑھ تحریک قوم کی عالمگیر تحریک بن رہی تھی اور اُس کا دائرۂ اثر

---

[۵۱] ہزرائل ہائینس پرنس آف ویلز۔

[۵۲] ۱۸۹۸ء تک گیارہ اولڈ بوائے ٹرسٹی اور سات اسٹاف کے ممبر تھے۔

تمام ہندوستان میں پھیل رہا تھا قوم اور حکومت میں کالج کے ٹرسٹیوں اور اسٹاف کا خاص وقار تھا کانفرنس کا پلیٹ فارم قابلیت کے جوہر دکھانے اور شہرت حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ تھا خدمتِ ملک و قوم کے حوصلے پورے کرنے کے لئے بھی یہ ہی میدان تھا، سرکاری مناصب و مراتب کی توقعات ذاتی ترقیوں کی اُمیدیں اور قومی سرداری و لیڈری کی آرزوئیں بھی کالج و کانفرنس سے وابستہ تھیں، اس لئے ہر اولڈ بوائے کو قدرتاً ان تحریکوں میں حصہ لینے کی دلی خواہش تھی۔

ان میں سے جو لوگ علی گڑھ میں مقیم تھے ان کو انتظامی کاموں میں داخل ہونے اور عہدے حاصل کرنے کا پورا موقع حاصل تھا لیکن چار سال کے اندر ہی باہم تنگ دلی کی شکایتیں پیدا ہوئیں اور اخوت و محبت عہدوں کی رقابتوں اور کشمکشوں میں مبدّل ہو گئی۔

۱۹۰۳ء میں مسٹر (مولانا) محمد علی جب آکسفورڈ سے بی اے آنرز کی ڈگری لیکر آئے تو اُنھوں نے اسٹاف میں شامل ہونے کی درخواست پیش کی۔

ان کی قابلیت مسلّم تھی کالج کے ساتھ جوش و جذبہ میں کسی کو شک نہ تھا نواب محسن الملک کی خواہش تھی کہ اُس سے فائدہ اُٹھایا جائے لیکن وہ ذہنیت جو انگلش اسٹاف اس درس گاہ کی تعلیم و تربیت کا جوہر سمجھتا تھا محمد علی میں موجود نہ تھی اس لئے مارین صاحب کی سخت مخالفت سے درخواست مسترد ہوئی بعض کے نزدیک اس میں برادرانِ یوسف کا دخل تھا۔

ادھر بر سرِ موقع اصحاب کی ایک خاص جماعت بنتی جا رہی تھی ٹرسٹیوں کی جماعت اور اسٹاف کے ممبروں میں اسی کے ارکان زیادہ تھے اور اولڈ بوائز اور کانفرنس پر اسی کا قبضہ تھا، زنانہ تعلیم کی تحریک بھی اسی کے ہاتھوں میں تھی

اور وہ اپنے حلقۂ احباب کے سوا اوروں کے داخلہ کے لئے سدّ راہ تھی یا سمجھی جاتی تھی۔ ۱۹۰۴ء سے ان کے اختلافات نے کالج اور دیگر تحریکوں پر معاندانہ انداز سے اثر ڈالنا شروع کیا۔ تھوڑے عرصہ میں رقابتیں اور کشمکشیں بہت تلخ اور تند ہو گئیں۔ چنانچہ ۱۹۰۵ء کے اجلاس کانفرنس کے موقع پر دو متقابل پارٹیاں تھیں۔ ایک پارٹی کے لیڈر مولانا شوکت علی نے مشتعل ہو کر دوسری پارٹی کے ممبر (خان بہادر) شیخ عبداللہ ایڈووکیٹ پر قانونی حملہ کیا، جو ٹرسٹی اس وقت موجود تھے انہوں نے جلسۂ مشاورت منعقد کر کے حملہ آور کو ٹرسٹیز کمیٹی سے خارج کرنے کی سفارش کی، اولڈ بوائز نے بھی فوراً ایک جلسہ منعقد کر کے مولانا شوکت علی سے خواہش کی کہ اولڈ بوائز کا وقار قائم رکھنے کے لئے خود مستعفی ہو جائیں ورنہ ان کو اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کی ممبری سے خارج کر دیا جائے اس کی تائید میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے نہایت پُر زور تقریر کی اور نتیجہ میں استعفا داخل ہو گیا۔

ایک ہنگامہ خیز واقعہ اتفاق سے اس جدید دور میں طلبا ر نے بورڈنگ ہاؤس کے انتظامات کے متعلق چند شکایتوں کا ایک میموریل ایک سینیئر طالب علم سید مصطفےٰ حسین رضوی کے ذریعہ سے پرنسپل کے سامنے پیش کیا جن کا اثر (مسٹر گاڈنر بردن) پر دوست پر پڑتا تھا، ادھر حالت یہ تھی کہ مسٹر آرچبولڈ ممبران اسٹاف کے زیر اثر آ گئے تھے اور مسٹر گاڈنر بردن وغیرہ نے ان کی غلط رہنمائی کی تھی انہوں نے اس میموریل کو ڈسپلن کے خلاف سمجھا اور بغیر تحقیقات شکایات طالب علم مذکور کو بورڈنگ ہاؤس چھوڑ دینے کا حکم دیدیا۔

نواب محسن الملک ایسے طلبا ر پر جو قومی کاموں میں دلچسپی و سرگرمی ظاہر کرتے تھے خصوصیت سے شفیق تھے اور ان کی یک گو نہ تربیت کرتے تھے اور زیادہ تر کانفرنس کے کام لیتے تھے سید مصطفےٰ حسین بھی اس کی اسٹینڈنگ کمیٹی کے ممبر تھے، اس واقعہ اخراج

کے بعد کمیٹی کے ایک جلسہ منعقدہ ۲۹ اکتوبر میں حسب ضابطہ شریک ہوئے، مسٹر آرچبولڈ ان سے اتنے ناراض تھے کہ اُنھوں نے کہا کہ میں یا مصطفیٰ حسین دونوں میں سے کسی ایک کو میٹنگ سے چلا جانا چاہیئے" ناچار مصطفیٰ حسین کو چلا جانا پڑا" اب یہ معاملہ قومی توہین کا سوال بن گیا، علی برادرس نے سوالات کی بوچھار کردی اور غضب آلود خطوط تحریر کئے۔

مولانا محمد علی کا ایک خط
۲۶ نومبر

باوجود غم ہائے خانگی میں اپنی ستمبر کی تحریر کے جواب کا منتظر ہوں اب تو لاٹ صاحب اور لارڈ کچنر بھی آچکے اور رڈپوٹیشن کیس کا ٹھنڈا ہو چکا دوسرے کام ضرور رہوں گے مگر وہ تو جان کے ساتھ ہیں ؎

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

اُنھیں مکروہات زندگی میں میرے خط کو بھی سمجھ لیجئے اور جواب دیجئے مگر جواب صاف ہو گو جواب تلخ ہی کیوں نہ ہو، حال کے واقعات کا ذکر سن کر میں اپنے عزیز کی موت کو بھی بھول گیا اور کالج وقوم کی وفات پر انا للہ و انا الیہ راجعون پڑھکر دو چار آنسو بہا لیتا ہوں، بہتر ہے کہ جو کچھ ہوا ہوا اب آپ اس مردہ قوم کو اس کے حال پر چھوڑ دیں اور اپنی بوڑھی ہڈیوں کو آرام دے لیں، ساری عمر انہیں آرام نصیب نہیں ہوا ہے، لاٹ صاحب آئے، لارڈ کچنر گئے، امیر صاحب آئیں گے اور لارڈ منٹو تشریف لائیں گے، مگر مارا چہ ازیں قصہ۔ نہ ان سے کالج کو فائدہ پہونچتا ہے نہ قوم کو نہ آپ کو، مسلمانوں کو چند چھوٹی یا بڑی نوکریاں مل جائیں گی آپ کو ایک ذلیل اور بے وقعت خطاب عطا ہوگا مگر یورپین اسٹاف کا نام بھی ہوگا، عزت بھی بڑھے گی اور آپ کو قوم کا روپیہ بھی جس کو آپ نے خون بہا کر پیدا کیا ہے ملے گا، چشم ما روشن دل ما شاد، آپ کو ایک دن سید احمد خاں سے ملنا ہے، ان کو کیا جواب دیجئے گا،

جعلناك فی الارض خلیفا کی یہی تفسیر ہے۔

نواب صاحب کا جواب امیر صاحب کی آمد کا زمانہ قریب تھا اور نواب صاحب اس ہنگامہ آرائی سے بچنا چاہتے تھے انہوں نے نرمی سے جواب لکھے اور ایک خط میں سمجھایا کہ :-

"میں کل دہلی جاتا ہوں پھر وہاں سے بمبئی جاؤں گا اور وہاں سے لکھنؤ اور الہ آباد، اور الہ آباد سے کلکتہ اور ڈھاکہ کو، آپ کے سوالات کا جواب اس وقت نہیں دے سکتا، ہز مجسٹی امیر کابل جب آئیں گے اس وقت آپ کو آنا ہوگا اور مل کر تمام ضروری باتوں کا تصفیہ ہوگا۔ یہ اس صورت میں جب کہ آپ مجھے اپنا بزرگ یا اپنا دوست سمجھو اور اگر تم اپنے آپ کو ممبر اور مجھے سکریٹری سمجھنے پر راضی ہو اور صرف یہی تعلقات رکھنا چاہتے ہو اور کالج کو پارلیمنٹ بنانا اور مجھے سکریٹری آف اسٹیٹ کا درجہ دینا مفید سمجھتے ہو تو میں ضابطہ سے سوالات کے جواب دینے کو حاضر ہوں، پہلے اس کا تصفیہ کرنا چاہیے کہ ہمارے اور تمہارے درمیان تعلقات کیا ہیں اور کیا رہنے چاہئیں، اس کے بعد سارا مرحلہ آسان ہے"

(مولانا) محمد علی نے اس خط کے جواب میں پھر ایک نہایت طولانی خط لکھا کہ :-

دوسرا خط ۱۰ دسمبر ۱۹۰۶ء جناب والا- شرف نامہ مورخہ ۲۹ نومبر ملا۔ کثرت کار کی وجہ سے ایسی اہم تحریر کا جواب اب تک نہ دے سکا۔ افسوس ہے کہ آپ دہلی ہو کر بمبئی تشریف لے گئے اور مجھ سے بغیر ملے گئے یہ برتاؤ سکریٹری کالج و کانفرنس کے شایاں ہو یا نہ ہو مگر میرے ایک عزیز بزرگ اور شفیق سرپرست کی محبت سے بعید تھا۔

آپ فرماتے ہیں کہ یہ سوالات ابھی نہ کرو جب امیر صاحب آویں گے فیصلہ

ہو جائے گا۔ اور یہ اس صورت میں کہ تم مجھے اپنا بزرگ یا دوست سمجھو۔

نواب صاحب قبلہ۔ آپ آج اُس رگ کو چھیدتے ہیں جو بہت عرصہ سے نشتر کی لذت سے آشنا ہو رہی ہے، انسان کے دل کا حال سوائے اُس کے یا اُس کے خدا کے دوسروں پر ظاہر نہیں ہوتا، اگر ہو سکتا تو آپ یہ سوال نہیں کرتے کہ کیا تم مجھے اپنا بزرگ یا دوست سمجھتے ہو۔ جو محبت آپ کی میرے دل میں ہے کاش وہ محبت آپ کے عزیزوں کے دل میں بھی ہو، اگر آپ کو باور نہیں تو میرے پاس سوائے اس مضغۂ گوشت کے جس کو لوگ دل کہتے ہیں اور جس کو ہر زمانہ اور ہر ملک کے شعراء نے محبت کا ذخیرہ اور دفینہ مانا ہے، کوئی گواہ، کوئی شاہد، کوئی ثبوت نہیں، مگر میں یہ کہے بغیر بھی نہیں رہ سکتا کہ مجھے سوائے آپ کے اوروں سے بھی اُنس و اُلفت ہے اور وں کو بھی عزیز سمجھتا ہوں جن میں سے ہم پانچ بھائیوں کا سرتاج مگر میرے نزدیک میرا اکلوتا بھائی شوکت بھی ہے، شاید اس سے تو کسی کو بھی انکار نہ ہوگا۔

اب اگر میں دیکھوں کہ میرا بھائی شوکت کوئی ایسا کام کرتا ہے جو میری قوم کے لئے مضر ہے، میرے ملک کے نقصان کا باعث ہے یا میرے ہموطنوں کا تباہ کن ہے تو واللہ باللہ مجھے اِس میں دریغ نہ ہوگا کہ دو چھُریاں تیز کروں اور ایک اُس کے گلے پر دن کو یا رات کو چھپے، چوری یا علانیہ، زبردستی یا دھوکے سے پھیر دوں، پھر بہ تقاضائے محبت دوسری اپنے گلے پر بھی پھیر دوں جو حرکت نابینا سیمسن (Samson) نے فلسطینوں (Phillistins.) کے ساتھ کی تھی اور اپنے اوپر اور ساری قوم پر ایک عظیم الشان عمارت کو ڈھا دیا تھا اور جس آفت میں اوروں کو پھنسایا تھا اُسی میں خود پھنس کر مر گیا تھا وہی کام کرنا غیرت قومی کا تقاضہ ہے اور وہ ہی موت مرنا میری محبت ذاتی کے لئے

موزوں ہے۔

جب یہ میرے خیالات ہوں تو کیا آپ جو قبر میں پیر لٹکائے بیٹھے ہیں مجھ کم عمر خادم قوم سے کہہ سکتے ہیں کہ بھائی تو قوم کو مارتا ہے تو مار، بچوں، عورتوں اور جوانوں کو تباہ کرتا ہے تو تباہ کر۔ خود جوان مرگ مرتا ہے تو مر، مگر میری مٹھی بھر بوڑھی ہڈیوں کو بچائے رکھنا۔ نواب صاحب، کیا ساری عمر آپ کا یہی شیوہ رہا ہے؟ نہیں ہرگز نہیں، کیا سرسید احمد خاں کا یہی اصول تھا؟ نہیں کبھی نہیں۔ تو پھر اس کے کیا معنی ہیں کہ اگر تم مجھ کو اپنا بزرگ یا دوست سمجھتے ہو تو تم سے امید ہے کہ ایک قومی بے عزتی کو میری خاطر گوارا کر لوگے، مسلمانوں کے جوتیاں لگوا لوگے، ان کو سب قوموں میں ذلیل کرا لوگے تاکہ میں ایک مشکل اور نازک کام سے سُبک دوش ہو جاؤں۔

میرے شفیق، یہ نہ سمجھنا کہ میں آپ پر ذاتی بزدلی یا خود غرضی کی تہمت دھرنا چاہتا ہوں، حاشا و کلا میرا ایسا خیال نہ کبھی تھا نہ اب ہے، مجھے علم ہے کہ آپ کی ساری عمر کی کوششیں صرف اس..... تمغۂ قیصر ہند کی تمنا میں نہ تھیں نہ آیندہ کسی صلہ یا خطابات کی آرزو میں جاری رہیں گی، اب آپ منزل عمر کے اُس حصہ پر آ گئے ہیں کہ ذرا گردن اٹھا کر عالم جزا کی سیر بھی کر سکتے ہیں اور آپ کی نظر میں یہاں کے انعام اور صلے، سینے اور جھوسٹے، سلے، ستارے سے زائد وقعت نہیں رکھتے گو خدا اُس زمانہ کو ابھی دور رکھے، مگر آپ کو معلوم ہے کہ وہ زمانہ کچھ ایسا دور نہیں ہے جب کہ آپ ایسی جگہ چلے جائینگے جہاں نہ نائٹ ہڈ کی فکر ہے، نہ تمغوں کی تمنا، جہاں نہ آرزو ہے نہ خواہش و یبقیٰ وجہ ربك ذوالجلال والاکرام اور رضوان اللہ ہی سب سے بڑا آرڈر ہے اور سب سے معزز تمغہ جو کچھ آپ کر رہے ہیں قوم کی خاطر اور سب سے بڑا ثبوت آپ کی محبت کا یہ ہے کہ اس کی بہبودی کے لئے آپ ہر ذاتی بے عزتی اور ہر ذاتی بے حرمتی کو گوارا کر رہے ہیں اور زہر ہلاہل کے گھونٹ شربت

کے سے مرنے سے لے کر پی رہے ہیں، مگر جو راستہ آپ نے لیا ہے وہ آپ کو منزل مقصود تک ہرگز نہ پہونچائے گا۔

عزم سفر مغرب و رو در مشرق
اے راہ رو پشت بمنزل ہشدار

یہ کعبہ کی راہ نہیں ہے، یہ ترکستان کا راستہ ہے، یہ غلطی آپ کے دل کی نہیں ہے، دماغ کی ہے۔

یہ کہنا چھوٹا منہ بڑی بات ہے مگر بسا اوقات ایسا ہوا ہے کہ بڑوں کو چھوٹوں کے ایک اشارہ نے مدد دی ہے، بائبل میں درج ہے کہ خدا لوگوں کی ہدایت شیر خوار بچوں کی زبان سے کرا دیتا ہے، مجھے بھی انہیں شیر خواروں میں سے سمجھ لیجئے، میرے پاس وحی نہیں آتی، مجھے الہام نہیں ہوتا، مگر تائید غیبی کے ہزار راستے ہیں، اور میرا دل گواہی دیتا ہے کہ میں حق بجانب ہوں اور اگر آپ اولی الابصار میں سے ہیں تو ممکن ہے کہ میرے ہی توسط سے ہدایت پا جائیں۔ انگریزی کا مقولہ ہے کہ:۔

Discretion is the better part of valour

Valour is the best discretion مگر بسا اوقات بھی صحیح ہو جاتا ہے۔

جس طرح سے لوگ کہتے ہیں کہ ایمانداری ہی سب سے بہتر حکمت عملی ہے۔ اسی طرح میں کہتا ہوں کہ آج ہماری قوم کے لئے ہمت ہی سب سے عمدہ ترکیب ہے۔

آپ کی تحریر کا منشا صرف یہ ہے کہ گو واقعہ سخت ناگوار ہے، مسٹر آرچبولڈ نے سخت غلطی کی اور قوم کی سخت بے آبروئی ہوئی، مگر ایک انگریز سے اس کی سخت سے سخت غلطی کا اعتراف کرانا اور جس شخص یا جس جماعت کے ساتھ برا سلوک کیا گیا ہے ایک انگریز کا اس شخص یا اس جماعت سے معافی منگوانا بمنزل ناممکنات کے ہے، یہ

سب اس وجہ سے کہ وہ شخص انگریز ہے گو ہمارا نوکر اور جس شخص یا جماعت کے ساتھ ناواجب سلوک ہوا وہ ہندوستانی گو آقا۔

اب آپ فرمائیے کہ اگر اسی طرح اس معاملہ کو رفع دفع کر دیا گیا تو آپ کس طرح اطمینان کرا سکتے ہیں کہ آئندہ اس قسم کے واقعات پیش نہ آئیں گے اور اگر کوئی اطمینان نہیں ہو سکتا تو سوائے اس کے کیا مطلب ہے کہ ایک بنئے کی طرح ہم بھی کہیں کہ "دو سالے ایک کے تو مار"، اس واقعہ کے رفع دفع کرنے کا صرف یہی نتیجہ ہوگا کہ موذی کی ہمّت دوچند ہو جائے گی اور آئندہ اس سے بھی زیادہ ایذا پہنچے گی۔ کوئی شخص جسکو خدا نے غیرت و حمیّت دی ہے کالج کے معاملات میں شریک نہ ہو سکیگا۔ اور جب ہم اس کی شرکت سے دور رہے تو وہ ہمارا کالج کس طرح رہا۔ اگر ہمیں قومی کالج قائم رکھنے کا خیال ہوگا تو مجبوراً ایک دوسرا کالج قائم کرنا پڑے گا جس میں کسی انگریز سے یا گورنمنٹ سے کسی طرح کی مدد نہ لی جائے گی، یا اگر یہ ناممکن ہوا تو قومی کالج کو خیرباد کہہ کر اور قوم کا (بحیثیت قوم) جنازہ نکال کر اُسے سرسید کی قبر کے بازو میں دفن کر دینگے اور دو چار آنسو بہا کر اپنے ارادوں اور منصوبوں کو بھول جائیں گے۔

آپ شاید فرمائیں کہ مسٹر آرچبولڈ سے اور آپ سے اس معاملہ میں گفتگو ہو چکی ہے آئندہ وہ کبھی ایسا نہ کریں گے اور اپنے کئے پر وہ پشیمان ہیں اگر یہ امر واقعہ ہے تو سخت افسوس ہے مسٹر آرچبولڈ کی بزدلی پر کہ جس کام کو یعنی معافی مانگنے کو وہ درست و بجا سمجھتے ہیں صرف تھوڑی دیر کی ذلت کے خیال سے اُس کے کرنے سے ہچکچاتے ہیں اور افسوس ہے اُن کی خودغرضی پر کہ وہ اپنی ذرا سی ذلت کا تو اتنا خیال کرتے ہیں اور ایک شریف مسلمان، فدائے قوم اور اُس کی قوم کی ذلت کا ذرا پاس نہیں کرتے ایک غلطی کرنا شرمناک ہے مگر اُس کا اعتراف نہ کرنا اُس سے زیادہ گناہ ہے اور دل میں اعتراف کرنا اور زبان سے اُس کا ادا نہ کرنا سب سے بدتر، عذر گناہ، بدتر از گناہ

اگر مسٹر آرچبولڈ معافی مانگنے پر راضی نہیں تو صرف یہی ممکن ہے کہ ٹرسٹیان کالج اُن کو خیرباد کہیں، مگر آپ فرمائیں گے کہ اس کا صریح نتیجہ یہ ہوگا کہ سارا یورپین اسٹاف کالج چھوڑ کر چلا جائے گا پھر کوئی یورپین کالج میں نہ آئے گا اور گورنمنٹ کالج کی مدد نہ کرے گی اور اُس کی مخالفت کرے گی۔

یہ اعتراض بظاہر بہت قوی ہے، مگر در اصل نہایت کمزور ہے، کیا آپ بھول گئے ہیں سرسید کی اُن پُرزور تحریروں کو جو پنجاب یونیورسٹی قائم ہوتے وقت اُنھوں نے ورناکیولر یونیورسٹی کے خلاف لکھی تھیں اور صاف صاف کہدیا تھا کہ اگر گورنمنٹ ہماری تعلیم کو بگاڑنا چاہتی ہے تو ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنا کالج علیحدہ کھولیں اور اپنی اولاد کو گورنمنٹ کے مدارس سے یک لخت اُٹھالیں۔ اگر آپ میں بھی وہ ہی ہمّت ہے تو آپ یہ اعتراض کبھی پیش نہ کریں گے، میں اِس کام کی مشکلات سے بخوبی آگاہ ہوں اور خوب جانتا ہوں کہ یہ بلا کا سامنا ہوگا۔ مگر یہ فیصلہ ہوگا آپ کی قوم کا اور اگر یہ نیم جاں اِس قابل ہے کہ علاج ومعالجہ سے اِسے کچھ فائدہ ہوسکتا ہے تو وہ آج ہی ثابت ہوجائے گا، اگر قوم میں اِس قدر طاقت نہیں ہے اور اگر اُس کے لیڈر اُس کام کے اہل نہیں ہیں تو کاہے کو یہ سب کھٹر بگا لگایا ہے، جہاں قوم کل مرنے والی ہے وہاں آج ہی مرجائے تو بہتر۔

مگر میں سمجھتا ہوں کہ گورنمنٹ اس قسم کا فیصلہ کبھی نہیں کرسکتی اور یورپین پروفیسر لانے کا میرا ذمّہ۔ آکسفورڈ سے دس قابل یورپین انہیں تنخواہوں پر میں لادوں گا مسٹر آرنلڈ اور مسٹر کیری اب بھی آجائیں گے ورنہ اپنے تعصّب کا صاف اظہار کردیں گے اور گورنمنٹ کو اس وقت مسلمانوں کا خوش رکھنا منظور ہے ہر طرف مسلمانوں کی تعریف کا غلغلہ ہے اور کالج کا نام ہر فرد بشر کی زبان پر ہے اگر یورپین اسٹاف ایسے موقع پر کالج چھوڑ کر چلا جائے گا تو بھی کسی کو کچھ کہنے کی گنجایش نہ ہوگی۔

کیوں کہ اپنے ہی مُنہ سے کالج کو اچھا کہہ چکے ہیں اس وقت اگر کچھ شور و شغب ہوا تو ایک اعلان اصل وجوہ کا شائع کیا جا سکتا ہے اور ثبوت آپ کے پاس اس قدر صاف اور کافی ہے کہ پھر کچھ کرنے کی ضرورت نہ ہوگی اور لارڈ منٹو سے آپ بالمشافہ گفتگو کر سکیں گے۔ سر بمفلڈ فلر کے استعفے کے بعد کسی انگریز کا کالج سے علیحدہ ہونا نہایت غیر موزوں ہوگا، کیونکہ جب گورنمنٹ نے ایسے اسکولوں تک کو نہ توڑا جہاں مخالفت کھلم کھلا ہوتی تھی اور ایک لفٹنٹ گورنر کو علیحدہ کر دیا تو جس کالج کی وفاداری زبان زد خلایق ہے اُس کو انگریزوں یا گورنمنٹ کا دشمن ثابت کرنا اور اُسے نقصان پہنچانا بالکل ناممکن ہوگا۔

یہ معاملہ سخت مشکل ہے، سخت نازک ہے، سخت اہم ہے، یہ سب سہی مگر ایسی ہی مشکلات کا سامنا کرنا مردوں کا کام ہے۔ سر بمفلڈ فلر کا مستعفی ہونا، کالج کی تعریف پرنس آف ویلز کی زبانی اور لارڈ کچنر اور لارڈ منٹو اور امیر کابل کا کالج میں آکر اس کی تعریف کرنا اور سب اخبارات کا اُس کی تائید کرنا، ڈپوٹیشن کا شملہ جانا اور بانیلِ مرام واپس آنا سوائے مشیتِ ایزدی کے کچھ نہیں۔ اگر اس موقع کو ہاتھ سے دے دیا تو سمجھ لیجئے کہ آپ مسلمانوں کے لیڈر نہ ہوں گے بلکہ ہر ہبے ریشیا یورپین پروفیسر اپنے کو اس قوم کا فرعون سمجھے گا نہ یہ مصلحتیں موجود ہوں گی نہ آپ میں وہ طاقت ہوگی۔ ہمیشہ کے لئے کالج آپ کے اور ہمارے ہاتھوں سے نکل جائے گا۔

حبیب اللہ[1] خاں صاحب اتفاقاً مجھے غازی آباد کے اسٹیشن پر مل گئے تھے اُنھوں نے میرے سوالات کے جواب میں یہ فرمایا کہ مجھے ان چند ماہ کے ذاتی تجربہ سے ثابت ہو گیا ہے کہ کالج کبھی کا مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل گیا۔ مگر مجھے اب بھی اُمید ہے، کاش آپ مایوس نہ کر دیں۔ رہا آپ کو سکرٹری آف اسٹیٹ سمجھنا،

---

[1] خان بہادر ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر شاہ جہاں پوری۔

اور اپنے کو پارلیمنٹ کا ممبر، اور اس تعلق کے خیال سے سوالات کرنا، تو سنئے نوابصاحب یہ بارہا ہوا ہے کہ دو بڑے دوست یا دو عزیز مختلف پارٹیوں میں ہوں اور جب کوئی اہم قومی مسئلہ پیش ہو تو وہ ایک دوسرے سے سوالات پوچھیں یا ایک دوسرے کی مخالفت کریں۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ میں آپ سے ضابطہ کے چند سوالات پوچھوں اور آپ جواب نہ دیں تاکہ دوستی اور خوردی و بزرگی کے تعلقات قائم رہیں وہ باہمی محبت و شفقت و عظمت و وکوڑی کی ہیں جو اس اختلاف آرا کی متحمل نہ ہو سکیں اور یہاں تو خدا کے فضل سے اختلاف آرا بھی نہیں۔ مصطفیٰ کے آپ سے تعلقات باپ بیٹے کے رہے ہیں اور قوم کے آپ مہدی اور محسن، پھر اگر مجھے ان دونوں سے ہمدردی ہو تو آپکو کیوں بُرا معلوم ہو؟ برخلاف اس کے کہئے کہ :- ع

نہ ہو تو کیوں مجھے پیارا میرے پیارے کا پیارا ہے

اگر اختلاف آرا کبھی ہو گا بھی تو یاد رکھئے کہ باہمی محبت اُس کو صرف دماغی مخالفت تک جائز رکھے گی، دلی محبت میں کسی طرح کی کمی نہ ہوگی۔ یہ تو سب زبانی جمع خرچ ہے مگر جب چارلس اوّل اور پارلیمنٹ میں لڑائی شروع ہوئی اور تلواریں میان سے نکلیں اور خون بہانے کی تیاریاں ہونے لگیں، اس وقت اکثر ایسا ہوا کہ بھائی بھائی کے خلاف لڑا اور دوست دوست سے جُدا ہوا اُس وقت والر نے اپنے ایک دوست کو جو اُن کے خلاف لڑنے والا تھا لکھا۔

"جو خدا کہ دلوں کا حال جاننے والا اور مالک ہے وہ خوب جانتا ہے جو محبت تمہاری میرے دل میں ہے، یہ مخالفت اُس کو کسی طرح کم نہیں کر سکے گی جس لڑائی میں ہم دونوں شریک ہوتے ہیں اُس کا کیا فیصلہ ہو گا اور حق بجانب کون ہے کوئی نہیں کہہ سکتا اور مجھے تو اس لڑائی سے جو نفرت ہے وہ ظاہر ہے کہ یہ بے غنیم کی لڑائی ہے۔ مگر ہم کو جو جو کام سپرد ہوا ہے اُس کے کرنے سے ہم کو انکار نہ ہوتا

چاہیئے بلکہ اُسے پوری کوشش اور ساری محنت سے کرنا چاہیئے مگر جو کچھ ہم کریں اُسے ذاتی مخالفت سے مبرا اور خودغرضی سے معرا ہونا ضرور ہے، فی امان اللہ"

تو خدانخواستہ اگر میں اور آپ کبھی ایسی ہی ناگوار لڑائی میں شریک ہوں اور ایک دوسرے کے مقابلہ کی نوبت آئے تو خدا ہم دونوں کو توفیق دے کہ وہ لڑائی بے غلیظ کی لڑائی ہو اور ذاتی مخالفت سے مبرّا اور خودغرضی سے معرا ہو، آمین ثم آمین

آپ کا عزیز تابعدار - محمدؐ

اقتباس خط مولانا شوکت علی - ۱۳ / دسمبر -

"مجھ کو مجبوراً گزشتہ دسمبر کے واقعات کا جو از حد ناگوار تھے ذکر کرنا پڑتا ہے جو کچھ ہوا وہ فضول ہے، اس کی تاکید کرنا اور دُہرانا بالکل فضول ہے مجھ کو نہ تو خلیفہ محمد حسن[1] سے کچھ شکایت ہے، کیوں کہ وہ اور میں اجنبی آدمی تھے اور نہ اُن کو میں جانتا تھا نہ وہ مجھ کو جانتے تھے، نہ آفتاب[2] احمد خاں سے شکایت ہے، اُنہوں نے وہی کیا جس کی اُن سے توقع تھی اور توقع ہے، اُن کی خودغرضی اور تنگ خیالی سے یہ کب توقع تھی کہ وہ ایک معمولی مگر تکلیف دہ واقعہ کو رفع کریں گے پھر اُن سے شکایت کرنا بیجا تھی۔ شکایت اگر مجھ کو کسی سے ہوتی تو آپ سے اور آپ کے بعد علی امام[3] سے، علی امام سے بھی فقط دوستی اور محبت کی وجہ سے، مگر وہ مرد خدا ہی فقط میرے ساتھ رہا اور اُس نے ہی فقط ذاتی دوستی اور اُس کے ساتھ ہی بے سود دھمکیوں کی توجہ نہ کرکے اس ناگوار واقعہ پر سچی رائے دی، آپ سے مجھ کو اس سے کہیں زیادہ اُمید تھی، کیوں کہ نہ تو میں نے علی امام کی اسقدر اطاعت کی جس قدر آپ کی اور نہ اسقدر خدمت جتنی آپ کی، آپ کو خوب معلوم تھا کہ اس سال میں نے اپنے کالج کی بہبودی کے

---

[1] وزیر پٹیالہ۔ [2] صاحبزادہ [3] موید الملک سر۔ پٹنہ

لئے کس قدر کوشش اور لگا تار کوشش کی اور جو کامیاب بھی ضرور ہوتی اگر مجبوریاں آنہ جاتیں.............

آپ کے خطوط اور آپ کا دفتر خود میری اُس خدمت کی گواہی دے گا آپ کا دل دے یا نہ دے، پھر ایسی میں نے کونسی قومی کالج کے ساتھ دغا کی تھی کہ آپنے سب نے مجھ سے ایسا برتاؤ کیا اور مجھ کو سارے جہان میں بدنام کیا، میری اور ایک صاحب کی ایک ایسے معاملہ میں جس میں دونوں کو دلچسپی تھی سخت کلامی ہوئی اور اُس کے بعد ہاتھا پائی۔ بلاشبہ یہ ایک بہت مذموم بات تھی اور نہایت درجہ بے موقع وقت پر ہوئی مگر اس میرے ذاتی فعل کو کالج سے کیا تعلق تھا۔ اگر شیخ عبداللہ[۱] صاحب کو کوئی شکایت تھی تو اُن کی دل دہی کے لئے سرکار نے عدالتیں مقرر کر دی ہیں وہ مجھ پر انسالٹ کا دعویٰ کر کے تاوان میں ہزار روپیہ لیتے، میں کچھ مر نہیں جاتا، مگر یہ زیادتی اور بے قاعدگی میرے ساتھ کیوں برتی گئی۔ تاہم اگر اور لوگ کچھ کرتے آپ کیوں شریک ہوئے، میں اُن سے بھگت لیتا، آپ کو یاد ہوگا کہ میرے چہرہ پر کسی قسم کی پریشانی تمام شب نہ تھی مگر جس وقت آپ نے اُن کا فیصلہ اور سزا تجویز کردہ سنائی اور اُس کے ساتھ یہ بھی فرمایا کہ میں تم کو معطل کرتا ہوں، میرا چہرہ بدل گیا اور اسقدر صدمہ ہوا کہ آواز بند ہوگئی اور آنسو نکل آئے، وہ سزا کے ڈر کی وجہ سے نہیں بلکہ اسوجہ سے کہ جس ہاتھ نے میرے زخم لگایا اُس سے مجھ کو پیار کی اُمید تھی نہ کہ زخم کی اگر خلیفہ محمد حسین یا آفتاب احمد یا کوئی اور سزا سُناتا تو مجھ کو کچھ پرواہ نہ تھی، آپ سے یہ اُمید نہ تھی کہ میری خدمات اور محبت کو یک قلم اس طرح ان لوگوں کی دھمکیوں کی وجہ سے فراموش کر دیں گے۔ فراموش ہی نہیں بلکہ خود ان کے سرغنہ بن کر اپنے ہی ہاتھوں سے زخم لگایا اور اپنے ہی زبان سے حکم قتل دیا، آپ سے اگر محبت اور پیار کی اُمید

---

[۱] خان بہادر شیخ عبداللہ ایڈووکیٹ علی گڑھ۔

نہ بھی تو کم از کم انصاف کی تو بھی، اس کے علاوہ آپ کو خوب معلوم ہے کہ اصلی بنا ر فساد کیا بھی وہ گفتگو بھی کہ میرے اور آفتاب احمد[۱] کے درمیان ایک ہفتہ قبل آپ کے مکان پر ہوئی بھی میں تب بھی کہتا تھا اور اب بھی کہتا ہوں کہ یہ اصول جو آج کل ہم لوگوں نے علی گڑھ میں اختیار کیا ہے کہ سوائے ان چند لوگوں کے جو علی گڑھ میں مقیم ہیں اور شخص چاہے کیسا ہی قابل اور کام کرنے والا کیوں نہ ہو مگر اس کو کسی قسم کا اختیار دینا یا کسی کام کا ذمہ دار کرنا ہرگز نہ چاہیئے ایک دن ایسے جھگڑے کا بانی ہوگا جس سے سخت قومی نقصان ہوگا اگرچہ بعد کو فائدے حاصل ہوں۔ اس سال جو کچھ میں اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے لئے کرسکا اُس سے مجھ کو معلوم ہوگیا کہ ہمارا کام اس بُرے طریقہ سے چل رہا ہے جیسا کہ گذشتہ سال کانفرنس کے کام کا اندازہ میں اس واقعہ سے کرسکتا ہوں جو ۲۵ اکتوبر کو وقوع میں آیا۔ ایسے ایسے بہادر جلسہ میں موجود تھے اور کسی کی زبان سے یہ نہ نکلا کہ جناب پریسیڈنٹ صاحب بہادر جو کارروائی

---

[۱] ان مخالفتوں کی حقیقت نواب وقار الملک کے زمانہ میں اس وقت صاف طور پر نمایاں ہوئی جبکہ علی برادرس کو معاملات کالج میں داخل ہونے کا کچھ موقع ملا۔ اس زمانہ میں صاحبزادہ صاحب نے بورڈنگ ہاؤس کے سلسلہ انتظامات میں ایک یادداشت پیش کی جس کا مفاد یہ تھا کہ کالج انتہائی خطرہ میں ڈالدیا گیا ہے اور وہ خطرہ کی گھنٹی بجارہے ہیں لیکن چونکہ اب زمانہ آگے بڑھ چکا تھا۔ نواب وقار الملک ایک زبردست حزم وارادہ رکھتے تھے اور سازشوں کے کچلنے کی پوری طاقت رکھتے تھے۔ یہ حملہ ناکام رہا اور عرصہ تک اس فضا میں سکون ہوگیا لیکن بعد کو ۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۰ء تک ان ہی مخالفتوں نے فضا کو نہایت مسموم بنا دیا۔ پھر جب علی برادرس نے یہ محاذ چھوڑ دیا تو دوسری جماعت باہم متصادم ہوگئی چنانچہ صاحبزادہ صاحب کا پمفلٹ ۱۹۲۶ء اسی تصادم کا نتیجہ تھا، اس عرصہ میں بہت سے افسوسناک دتشویشناک واقعات پیش آئے متعدد ہستیاں اس دنیا سے ہمیشہ کو رخصت ہوگئیں لیکن اس سمیت کا اثر ہنوز موجود ہے جو اولڈ بوائز کی بعض مقتدر شخصیتوں کے باہمی عداوت سے پیدا ہوئی تھی۔

کہ آپ اس وقت پر سید مصطفےٰ حسن کے بارے میں کرنے کو ہیں وہ کس قاعدہ کی رُو سے جائز ہے اور پھر اُس کو چھپانا اور بھی سخت غلطی ہے۔ عام طور پر نہیں بلکہ سینٹرل اسٹینڈنگ کمیٹی خود بھی پریسیڈنٹ صاحب سے ان الفاظ کے واپس لینے کی درخواست کرسکتی ہے اور مسٹر مصطفےٰ احسن سے باضابطہ بذریعہ رزولیوشن کے معافی مانگ سکتی ہے لیجئے سب معاملہ طے ہوگیا۔ مجھ کو تعجب ہے کہ آفتاب احمد جو اس قسم کی غلطیوں کے دور کرنے کو سال گزشتہ تلوار لئے تیار تھے اس موقع پر کیوں روپوش ہوگئے، اور ساری بُرائی بھلائی کا بار ایک غریب نیک دل کمزور اور ناتوان بڈھے پر ڈال دیا ہے۔

قبلہ وکعبہ۔ آپ اوروں کے کیوں بے وجہ سپر بنتے ہیں اور ہم لوگوں کا گلا گھونٹتے ہیں ہم فریاد کرتے کرتے تھک گئے مگر کوئی شنوائی نہیں ہے آپ سے اور لوگوں سے سفارشیں اُٹھوائیں مگر ان کا کوئی اثر سوائے بُرا بننے اور دشمنی پیدا کرنے کے کوئی نہ ہوا۔ آخر تھک کر یہ ارادہ کرلیا کہ بلا توسل کسی کے جو اپنے خیال میں ایماناً اور انصافاً آئے گا وہ کریں گے مگر قومی کالج کو کبھی نہیں چھوڑیں گے، آپ یہ بھی ہم کو نہیں کرنے دیتے اور بجائے اپنے ماتحتوں کے درست کرنے کے ہمارے ہی گلے کو اور گھونٹتے ہیں ہم حیران ہیں کہ کیا کریں کب تک صبر کریں گالیاں کھائیں بُرا بنیں، قوم کے بدخواہ بنیں، اپنے عزیز کالج سے ذلیل ہوکر نکالے جائیں......................

مجھ کو آپ سے سخت ناامیدی ہوئی اور آپ نے مجھ سے وہ پدرانہ برتاؤ نہیں کیا جس کا میں مستحق تھا مگر مجھ کو اب تک برابر وہی محبت ہے جو پہلے تھی میں نے یہ بھی ارادہ کرلیا ہے کہ میں زیادہ آپ کے پاس نہ آؤں جب تک کہ میں خود اپنی کوشش سے وہ سب حاصل نہ کرلوں جو میں نے " آپ کی خدمت گزاری میں کھویا ہے، علی گڑھ سے امداد کی توقع نہیں اور آپ کو میں فضول اور تکالیف میں پھنسانا نہیں چاہتا خدا کو منظور رہی تو میں کامیاب ہوں گا آج نہیں تو زندگی کے ختم ہونے تک ضرور۔ اور اگر تب بھی نہیں تو دل کی

تسلی دینے کے لئے میرؔ کا پرانا شعر کافی ہے ؎

شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے اے میرؔ
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

اس معاملہ میں آپ کیا چاہتے ہیں صاف صاف فرمائیں میں اس معاملہ کو جب تک کہ باقاعدہ طور پر رزولیوشن کے ذریعہ سے مصطفےٰ حسن سے معافی نہ مانگی جائے اور وہ الفاظ واپس نہ لئے جائیں اس امر کو دبانا اپنے ایمان کے خلاف سمجھوں گا۔ پرنسپل کالج سے ہم کو کچھ واسطہ نہیں، اس کو بورڈنگ کا اختیار کامل ہے مگر سینٹرل اسٹینڈنگ کمیٹی کے اجلاس سے علیحدہ کرنے کے جواب دہ ہیں، آپ جس صورت سے چاہیں اس کو عمل میں لائیے آخر میں، میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ خدا کے واسطے آپ اس تنگ خیالی کو جو علی گڑھ کے رہنے والوں میں پیدا ہو گئی ہے کہ وہ ہم تک کو اس کا دشمن خیال کرتے ہیں اور بدگمان رہتے ہیں دور کرنے کی کوشش کیجئے اور کام کرنے والوں کا دائرہ وسیع فرمائیے تاکہ یہ آپ کا ہی پیدا کیا ہوا قحط الرجال دور ہو اور معترضین کو اعتراض کے بجائے کچھ کام کرنے کا موقع ملے ورنہ مجھ کو اندیشہ نہیں کہ ہم میں بہت سے لوگ بے دل ہو کر علیحدہ ہو جائیں گے اور قوم اور قومی جلسوں پر لعنت کر کر اپنے گھر کی مصروفیت میں پڑ جائیں گے اب تک سخت کوشش کی وجہ سے مجمع مخالفت نہ ہونے پائی، مگر اگر یہی لیل و نہار رہا تو ایک دن بہت زبردست شعلہ بلند ہوگا جس سے ضرور علی گڑھ کو نقصان پہنچیگا، خدا اور خدا کے رسول کے حوالے سے میں آپ کو قسم دیتا ہوں کہ آپ اس امر پر توجہ فرمائیے، اب تک آپ کی طاقت میں ہے کہ سب امور طے ہو جائیں مگر اگر دیر کی گئی تو سب معاملہ آپ کے ہاتھ سے باہر ہو جائے گا اور ہم کو سخت صدمہ ہوگا ....

قبلہ و کعبہ آپ کی عمر اب کچھ ہی سال کی اور ہے یہ وقت ایسا نہیں ہے کہ آپ سچے اور محبت کرنے والے عزیزوں کو اپنے سے دور پھینک دیں اور اُن کے لئے تازیانہ

تیار رکھیں ہم کو آپ سے محبت ہے اور آپ سے زیادہ کالج سے جس کی بدولت ہم کو سب کچھ عزت اور آرام ہے خدا کے واسطے ہم پر اس کا دروازہ بند نہ ہونے دیجیے ورنہ خدا کے سامنے آپ قیامت کے دن جواب دہ ہوں گے اور آیندہ آنے والی نسلیں آپ کے نام کے ساتھ مولانا روم کا یہ شعر منسوب کریں گی ؎

تو برائے وصل کردن آمدی یا برائے فصل کردن آمدی

معافی کا خواستگار اور تابعدار

شوکت علی

ایک اور اطلاع سید مصطفیٰ حسین نے بھی نواب صاحب کو ایک مفصل خط میں حسب ذیل اطلاع دی۔

"جن صاحبوں کو میرے ساتھ ہمدردی ہے وہ بگڑے ہوئے ہیں کہ میں نے اب تک ان کو اس معاملہ میں باضابطہ تحریک کرنے کی اجازت کیوں نہیں دی، عجیب مصیبت میں گرفتار ہو گیا ہوں ایک جانب تو حضور کا خیال دوسری طرف کالج سے تعلقات پر نظر اور اس پر دوستوں کا اصرار۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں اور میرے معاملات کیوں کر سلجھیں، بالآخر اس خیال کے ظاہر کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے کہ گو میں نے اپنے معاملات کو آپ کے ہاتھ میں دے رکھا ہے اور ان اشفاق کے لحاظ سے جن کا اظہار میرے ساتھ حضور نے ہمیشہ فرمایا ہے یہ ہی مجھ کو کرنا بھی چاہیے تھا، لیکن اب ایسی نزاکتیں پیدا ہو گئیں ہیں جن کو دیکھتے ہوئے خاموش بیٹھنا کسی طرح مناسب نہیں ہے، امید ہے کہ جناب میرے معاملات پر کافی غور فرمانے کے بعد کوئی مستقل رائے جلد قائم کریں گے کہ کیا ہونا چاہیئے اور مجھ کو ہدایت فرمائیں گے کہ میں کیا کروں، اپنی مختتم رائے سے جلد مطلع فرمائیے"

۸ر جنوری ۱۹۰۷ء

نواب محسن الملک کی ان مشکلات کو خان بہادر مولوی بشیرالدین صاحب نے بھی جن کو نواب صاحب موصوف کے ساتھ اس تمام مدت میں گہرا اور رازدارانہ تعلق رہا ہے مسلم یونیورسٹی کے بعض معاملات پر تبصرہ کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ :۔

البشیر کے مضمون کا ایک اقتباس

سرسید کے آخری زمانے میں وہ کالج کے برائے نام سکرٹری رہ گئے تھے اور عملاً مسٹر بیک کالج کے پرنسپل بھی تھے، اور آنریری سکرٹری بھی سرسید کے انتقال کے بعد مرحوم جسٹس سید محمود کالج کے آنریری سکرٹری ہوئے، ان کے زمانے میں مسٹر بیک تمام و کمال کالج کے مالک بن گئے تھے، ان کی خودمختاری اور خودسری اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ وہ کالج کے ٹرسٹیوں پر بھی نامناسب طریقے سے حکومت کرنا چاہتے تھے چنانچہ سرسید کے پرانے دوست مرزا عابد علی بیگ ٹرسٹی کالج کو جو خط مسٹر بیک نے شملہ سے لکھا اور ان کو دھمکی دی کہ کیوں تم کو کالج کی ٹرسٹی شپ سے علیحدہ نہ کیا جائے وہ علی گڑھ کالج کی تاریخ میں نہایت بدنما دھبہ ہے جس کی نظیر شاید دنیا کی کسی تعلیمی درسگاہ میں نہیں مل سکتی۔ مسٹر بیک کی اس قسم کی خودسرانہ حرکات کا نتیجہ یہ ہوا کہ مرحوم جسٹس محمود اور مسٹر بیک کے تعلقات بھی بہت زیادہ کشیدہ ہوگئے، اور نوبت یہاں تک پہونچی کہ مسٹر بیک کی کوشش سے مرحوم جسٹس سید محمود سکرٹری شپ سے علیحدہ ہونے پر مجبور ہوئے اور ان کی اشک شوئی اس طرح کی گئی کہ جماعت ٹرسٹیان کا ان کو پریسیڈنٹ مقرر کیا گیا۔ اس زمانہ میں باوجودیکہ نواب محسن الملک سکرٹری تھے، لیکن ان کی بےبسی اور بیکسی کا جس وقت مجھے خیال آتا ہے میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں ایک طرف مرحوم جسٹس سید محمود، محسن الملک کو اپنا رقیب اور حریف خیال کرتے تھے دوسری طرف مسٹر بیک ان کو کسی قسم کا کام کرنے کی اجازت نہ دیتے تھے، لوکل ٹرسٹی اور بعض بیرونی ٹرسٹی محسن الملک پر سخت اعتراض کرتے تھے، لیکن یہ مظلوم سید نہایت صبر اور تحمل کے ساتھ

ہر قسم کے اعتراضات سنتا تھا اور حقیقت حال کسی پر اس وجہ سے ظاہر نہ کرتا تھا کہ کالج جو لو آج ہے وہ بالکل برباد ہو جائے گا۔ سر سید کے انتقال کے بعد عرصہ تک کالج کا بجٹ ٹرسٹیان کے سامنے پیش نہیں ہوا، اس واقعہ کے متعلق مجھکو نواب وقار الملک نے ایک پرائیویٹ خط لکھا جس میں نواب محسن الملک کی شکایت کی تھی کہ اُنہوں نے اب تک کیوں کالج کا بجٹ ٹرسٹیوں کے سامنے پیش نہیں کیا، باوجودیکہ وہ ایک عظیم الشان ریاست کے فنانشل سکرٹری رہ چکے ہیں لیکن ایک چھوٹے سے کالج کا بجٹ تیار نہ کرنا آخر کیا معنی رکھتا ہے نواب وقار الملک کا یہ اعتراض معقول تھا۔ لہٰذا میں نے نواب محسن الملک سے زبانی اس اعتراض کا تذکرہ کیا اور اُن سے بے ضابطگی کی وجہ دریافت کی، میری گفتگو سن کر نواب محسن الملک نے ایک ٹھنڈا سانس بھرا کہ تمام کاغذات اور دفتر مسٹر بیک کے ہاتھ میں ہیں اور وہ مجھ کو بجٹ بنانے کا موقع نہیں دیتے اور اس بات پر مصر ہیں کہ بجٹ میں خود تیار کروں گا، آخر کار مسٹر بیک کا انتقال ہو گیا اور مسٹر ماریسن کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے لیکن جن لوگوں کو کالج کے معاملات سے واقفیت ہے، وہ تسلیم کریں گے کہ نواب محسن الملک اس زمانے میں کن مصائب میں مبتلا تھے، مسٹر ماریسن صاحب نہ صرف کالج کے اندرونی انتظامات میں دخیل تھے بلکہ وہ گورنمنٹ کے سیاسی معاملات میں کیونکر محمدن کالج کو آلہ بنائے ہوئے تھے، جو ڈیپوٹیشن ایران بھیجا گیا تھا، اس میں سکرٹری اور ممبران سے بغیر دریافت کئے اُنہوں نے کالج فنڈ سے ایک ہزار روپیہ نکلوا لیا۔ جب بعض لوکل ٹرسٹیوں نے اس کارروائی کی مخالفت کی تو مسٹر ماریسن نے نواب محسن الملک کو ایک خط بھیجا کہ اُن ٹرسٹیوں کے نام لکھو جو اس تجویز کے مخالف ہیں، تاکہ میں وائسرائے کے سامنے یہ نام پیش کر دوں، غرضکہ مسٹر ماریسن کی اس قسم کی بہت سی بے ضابطگیاں تھیں جو واقف کار لوکل ٹرسٹیوں کو ناگوار گذرتی تھیں اور اس کی شکایت نواب محسن الملک سے سخت الفاظ میں کرتے تھے اور پرنسپل کی ایسی خودمختارانہ کارروائیوں کو نواب محسن الملک کی بزدلی پر محمول کرتے تھے

نواب محسن الملک ایک طرف ٹرسٹیوں کی دھمکیاں سنتے تھے اور دوسری طرف پرنسپل کی نامناسب کارروائیوں سے دل برداشتہ رہتے تھے، انہیں جو کچھ فکر تھی وہ یہ تھی کہ کالج کی شہرت اور نیک نامی روز افزوں ترقی پکڑے، اور اُس کی مالی حالت کسی نہ کسی طرح اچھی ہو جائے اور کسی نہ کسی طرح کالج میں تعداد طلبار کا اضافہ ہو اور کالج مسلمانوں میں ایک مرکزی حیثیت حاصل کرلے، نواب محسن الملک اور مجھ میں ان مسائل کے متعلق پرائیویٹ گفتگوئیں بھی ہوئی ہیں، وہ لوکل ٹرسٹیوں کے درحقیقت شاکی نہ تھے بلکہ ان کو جو کچھ شکایت تھی وہ مسٹر ماریسن کی تھی، مرحوم محسن الملک ہمیشہ یہ کہا کرتے تھے، کہ یہ سب خرابیاں عارضی ہیں، زمانہ اس کی خود اصلاح کرلیگا، سب سے بڑی ضرورت کالج کی مالی حالت کا استحکام ہے اس زمانہ میں صوبہ کے لفٹنٹ گورنر سر انٹونی میکڈانل تھے جو نہایت سخت اور مسلمانوں کے دشمن تھے اور موقع کے متلاشی رہتے تھے کہ کس طرح مسلمانوں کی ترقی کو روک دیا جائے، اُردو ہندی کے جھگڑے کے بارے میں سر انٹونی میکڈانل کا جو برتاؤ نواب محسن الملک سے ساتھ تھا، وہ واقف کار حضرات سے پوشیدہ نہیں، دوسری طرف مسٹر ماریسن کا اثر نہ صرف لوکل گورنمنٹ میں تھا بلکہ گورنمنٹ انڈیا میں بہت بڑھا ہوا تھا اور جماعت ٹرسٹیان میں گورنمنٹ کا خوف اسقدر بڑھا ہوا تھا، کہ وہ سمجھتے تھے کہ اگر گورنمنٹ ناراض ہوئی تو کالج کی امداد بند ہو جائے گی اور بغیر گورنمنٹ کی امداد کے کالج نہیں چل سکتا اور سرکاری ملازمتیں جو مسٹر ماریسن کی وجہ سے مسلمانوں کو ملتی ہیں۔ آیندہ یہ ملازمتیں مسلمانوں کو نہ ملیں گی اور اس طرح مسلمانوں کی قوم کو سخت نقصان پہونچے گا۔ دوسری طرف کالج کے طلبار میں اسقدر سیاسی بیداری پیدا ہوگئی تھی کہ وہ مسٹر ماریسن کی اس قسم کی کارروائیوں سے سخت ناراض رہتے تھے، طلبار کی اس ناراضی کا یہ اثر ہوا کہ طالب علموں میں روز بروز ایسی جماعت ترقی کررہی تھی جو نہ صرف پرنسپل کے خلاف تھی بلکہ انگریزی قوم کے خلاف ان میں جذبات بھڑک رہے تھے، تیسری طرف بعض جوشیلے ٹرسٹی ان واقعات کو غم اور غصّے کے ساتھ دیکھتے تھے، غرضکہ مسٹر ماریسن نے استعفےٰ دیدیا،

اور اُن کی جگہ مسٹر آرچبولڈ پرنسپل ہوکر آئے، پرنسپل اور اُن کے یوروپین اسٹاف کا برتاؤ طالب علموں کے خلاف ہونا شروع ہوا۔ طالب علم ناراض ہوتے تھے اور اپنی شکایت نواب محسن الملک کے پاس لیکر آتے تھے، نواب محسن الملک طالب علموں سے حکمت آمیز گفتگو کرکے ان کی تسلی اور تشفی کرتے تھے، مسٹر آرچبولڈ کو طالب علموں کا نواب صاحب کے یہاں زیادہ جانا سخت ناگوار تھا، غرضکہ معاملات روز بروز پیچیدہ ہوتے گئے جس کا انجام طالب علموں کا سخت اسٹرائک ہوا۔ (اخبار "البشیر" دسمبر ۱۹۳۶ء)

طلبار کی شورش

۹ رفروری ۱۹۰۷ء کو علی گڑھ کی نمائش میں راجہ غلام حسین طالب علم اور ایک کانسٹبل میں خفیف سا جھگڑا ہوا جس کو نمایش کے سکریٹری نے جو اولڈ بوائے بھی تھے طالب علم مذکور کے خلاف طوالت دیدی، سوپرنٹنڈنٹ پولیس نے پرنسپل کو مطلع کیا اور خواہش کی کہ وہ خود سزا دیں ورنہ حسب ضابطہ مقدمہ چلایا جائے گا، پرنسپل نے راجہ کو سزا دی جو بہت سنگین تھی، چوں کہ راجہ بہت ہر دلعزیز اور قابل طالب علم تھا اور تھوڑے دن قبل ایک علمی بحث میں انگلش اسٹاف کے ایک ممبر کو اس سے خفت اُٹھانی پڑی تھی اور اس سزا میں اسی ممبر اسٹاف کا اثر سمجھا جاتا تھا، طلبا، جو نمائش میں موجود تھے وہ راجہ کو بے قصور جانتے تھے اور اُن کے نزدیک کانسٹبل کا قصور تھا اُنہوں نے پرنسپل کو توجہ دلائی لیکن کچھ اثر نہ ہوا اور انجام کار بعض غلط فہمیوں سے راجہ کا بورڈنگ ہاؤس سے بھی اخراج کیا گیا۔

پرنسپل کی اس کارروائی نے طلبا کو حد سے زیادہ مشتعل کر دیا وہ ۱۵ رفروری کو یونین کے سامنے جمع ہوئے اور جب اسٹاف نے منتشر ہونے کا حکم دیا تو اُنہوں نے سرتابی کی، باہم ایسی سخت گفتگوئیں ہوئیں جو دونوں کے لئے قابل افسوس اور باعث

اشتعال تھیں۔

نواب محسن الملک نے اس واقعہ کی اطلاع پاتے ہی طلبا کو فہمایش کی اور فوراً صورت حال سے قریب وجوار کے ٹرسٹیوں کو مطلع کیا۔

۱۷ فروری کو بیرونجات سے پندرہ ٹرسٹی علی گڑھ آگئے، اُنھوں نے واقعات پر غور کے بعد غلام حسین کی سزا مناسب تصور کی، طلبا کو سمجھایا کہ پرنسپل سے بلا شرط معافی چاہیں چوں کہ ان کو اسٹاف سے انتقام کا خوف غالب تھا، نواب محسن الملک نے یہ وعدہ کیا کہ ۱۵ فروری کے واقعات کی بنا پر کسی اور طالب علم کو سزا نہ دی جائے گی، چنانچہ ۱۹ فروری کو طلبار نے معذرت نامہ پیش کر دیا، غلام حسین نے بھی کالج چھوڑ دیا اور بظاہر اسباب یہ شورش رفع ہو گئی، لیکن ۲۱ فروری کو پرنسپل نے ۱۵ فروری کے گستاخانہ رویہ پر چھ دیگر طلبار کو بورڈنگ ہاؤس چھوڑ دینے کا حکم دیا۔

اس خلاف توقع سزا پر طلبار نے اوّل تو آنریری سکرٹری کو اُن کے وعدہ پر توجہ دلائی اور جب اُنھوں نے اپنی مجبوری ظاہر کر کے پرنسپل کے تعمیل حکم کی ہدایت کی تو ان میں سخت ہیجان پیدا ہو گیا، اب صورت حالات کے لحاظ سے یکم اپریل تک کالج بند کر دیا گیا۔

کمیشن کا تقرر

اسباب شورش کی تحقیقات آیندہ انسداد کی تدابیر اور ضروری اصلاحات کے لئے ایک کمیشن مقرر ہوا جس میں حسب ذیل اصحاب ممبر منتخب ہوئے۔

نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، مسٹر آرچبولڈ پرنسپل، مسٹر محمد رفیق بار ایٹ لا وجج، مرزا عابد علی بیگ، مولوی عبداللہ جان وکیل سہارن پور، خان بہادر شیخ عبداللہ ایڈووکیٹ، حاجی محمد اسمٰعیل خاں (دتاولی)

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب بھی منتخب ہوئے تھے لیکن وہ مستعفی ہو گئے۔[۵۱]

شورش کا سیاسی رنگ یہ ایک ایسا معمولی واقعہ تھا کہ اگر پرنسپل اور یورپین اسٹاف ذرا ہمدردی سے کام لیتا تو یہ نوبت نہ پہونچتی اور سارا معاملہ رفع دفع ہو جاتا، مگر اسٹاف نے اس واقعہ کو سیاسی رنگ دیدیا اور اتنی وحشت طاری ہو گئی کہ حفاظت جان کے لئے بنگلوں پر مسلح پولیس[۵۲] تعینات کرائی گئی، یہ شہرت بھی دی گئی کہ کانگریسی اخبارات اور یونین کے سیاسی مباحث کے اثر سے طلبا کے خیالات میں تبدیلی پیدا ہوئی اور کانگریس پارٹی نے روپیہ کی امداد بھی پیش کی۔

طلبا کی دانشمندی طلبا نے اپنی جماعت میں ایک نظام[۵۳] قائم کر لیا تھا اُنہوں نے اس شہرت کو سُنتے ہی ہز آنر ہیٹرن و لفٹنٹ گورنر کو تار دے کر اس امر کی نسبت اطمینان دلایا کہ یہ حالت صرف کالج کے اندر محدود رہی

۵۱؎ ان کی نسبت یہ مشہور تھا کہ کالج کے تمام کام اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتے ہیں اور یہ شکایت تھی کہ دوسری جماعت کے کسی ممبر کو وہ کاموں میں شریک نہیں ہونے دیتے، اس ہنگامہ میں نہ طلبا ان سے خوش تھے اور نہ اسٹاف دونوں کا اعتماد زائل ہو چکا تھا اس لئے اُنہوں نے فنانس کمیٹی ممبری بورڈ آف منیجمنٹ اور صیغہ تعمیرات کی سکرٹری شپ سے بھی استعفا دیدیا لیکن پھر کمیشن کی ممبری کے سوا باقی عہدوں کی نسبت استعفا واپس لے لیا۔

۵۲؎ اس ہنگامہ میں جب کہ حفاظت جان کے لئے مسلح پولیس کا پہرہ تھا، مسز آرچبولڈ جو فرانسیسی خاتون تھیں مجمع طلبا میں بلا خوف و خطر آتی تھیں اور طلبا ماں کی طرح ان کا احترام کرتے تھے۔

۵۳؎ اس منظم جماعت کے سکرٹری (ڈاکٹر) عبدالرحمٰن بجنوری تھے، ۱۹۱۸ء میں بمقام بھوپال انتقال کیا، قابلیت کا غنچہ پورا کھلنے بھی نہ پایا تھا کہ مُرجھا گیا۔

کوئی سیاسی حیثیت نہیں رکھتی اور تمام طلبا سرسید کی پالیسی پر ثابت قدم ہیں، انہوں نے اخبارات میں بھی ایک مفصل خط شائع کرایا جس میں ان تمام غلط بیانیوں کی جو اس واقعہ سے پھیلائی گئی تھیں تردید کی۔

نواب محسن الملک کی بے چینی

یہ شورش ایک معمولی واقعہ تھا لیکن اسٹاف نے اس پر جو سیاسی رنگ چڑھایا اور اپنی جانیں تک خطرہ میں محسوس کیں اور زیر سطح یا پس پردہ جو قوتیں کارفرما تھیں اُن سب نے مل ملا کر نواب محسن الملک کو انتہا سے زیادہ متردد اور بے چین کر دیا تھا، ان کے اس تردد اور اس بے چینی کا اندازہ ان خطوط[1] سے ہوتا ہے جو اُنہوں نے اس ہنگامہ کے دوران میں طلبا کے نام لکھے تھے، یہ تین خط مختلف حالتوں کے ہیں اور اس درجہ موثر ہیں کہ کوئی شخص چشم پُرنم بغیر ختم نہیں کر سکتا۔

ہزآنر پیسٹرن کی آمد اور ایڈریس و جواب

قبل ازیں کہ کمیشن اپنا کام شروع کرے، ۸ مارچ کو ہزآنر سرجان ہیوٹ تشریف لائے، سنان کالج میں آنریری سکرٹری پریسیڈنٹ اور گیارہ ٹرسٹیوں نے ایڈریس پیش کیا البتہ وہ چند طلبا جو علی گڑھ میں مقیم تھے شریک کر لئے گئے۔ ایڈریس میں عام امور کے علاوہ اس واقعہ کا بھی حسب ذیل تذکرہ تھا۔

"لیکن اس حالت میں، جب کہ ہم اپنے تئیں اس کالج کی ایسی ترقی اور طلبا کی تعداد میں اضافہ ہونے پر قابل مبارکباد سمجھتے ہیں ہم کو ان مشکلات کا بھی احساس ہے جو ایک ایسے درس گاہ کے انتظام میں جیسا کہ یہ ہے پیش آنی لازمی ہیں، خود سرسید مرحوم کے زمانہ میں ۱۸۹۳ء میں سخت مشکلات واقع ہو چکی ہیں اور اسی صورت کا ایک نازک موقع کالج کی اندرونی زندگی میں ابھی حال ہی میں پیش آیا ہے لیکن ایسے موقعوں پر ہم ہمیشہ سرسید کے اصول کو مدنظر رکھتے ہیں،

---

[1] ملاحظہ ہو مکاتیب حصہ اوّل۔

اور اُن پر استقلال کے ساتھ عمل کرنے کے لئے مستعد رہتے ہیں۔ کیونکہ ہم کو یقین ہے کہ صرف وہ ہی ایک طریقہ ہمارے لئے اپنے فرائض کی انجام دہی کا ہے جس میں یقیناً کامیابی کی اُمید ہے۔"

ہز آنر نے جواب میں کہا کہ

"کالج کے قد و قامت اور اُس کے دائرۂ اثر میں ترقی ہونے کے ساتھ آپ کی ذمہ داریاں بھی زور بروز بڑھتی جاتی ہیں، اگرچہ کالج کی عظیم الشان خوش حالی کی یہ علامتیں حوصلہ افزا ہیں، لیکن ہم اس امر سے چشم پوشی نہیں کر سکتے کہ اس مسئلہ کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ کالج کے عرض و طول کے بڑھنے کے ساتھ انتظامی مشکلات گھٹتی نہیں ہیں، مجھے یہ بات دریافت ہونے سے خوشی ہوئی کہ آپ ایک پُر تفتیش تحقیقات اس ہنگامہ کے متعلق جو حال میں یہاں واقع ہوا ہے کرنی چاہتے ہیں، چوں کہ میں نے سب سے قدیم انگلش پبلک اسکول اور آکسفورڈ میں تعلیم پائی ہے، لہذا یہ ایک قدرتی بات ہے کہ آپ کی مانند میں بھی ایک ایسے کالج میں جیسا کہ یہ ہے "ڈسپلن" قائم رکھنے کو نہایت ہی بیش قیمت تصوّر کروں، آپ کے لئے اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں ہے کہ کالج کے متعلق اپنے انتظام میں آپ سرسید مرحوم کے قرار دادہ اصول کی جس کا آپ نے اپنے ایڈریس میں ذکر کیا ہے پیروی کریں کچھ شک نہیں کہ آپ کی تحقیقات نہ صرف ان واقعات تک ختم ہو جائے گی جو عملاً واقع ہوئے ہیں اور جن کو چشم ظاہر بیں اس تازہ خطرہ کا جو آپ کے معاملات میں پیش آیا، باعث خیال کر سکتی ہے، بلکہ آپ کی تحقیقات یہ دریافت کرنے کی طرف بھی مائل ہوگی کہ آیا زیر سطح بھی کچھ اسباب ایسے ہیں جو طالب علموں کے ایک ایسے طرز اختیار کرنے کے باعث ہوئے، جو کہ ایسے تعلقات

کے منافی ہیں جیسے کہ استادوں اور شاگردوں کے درمیان ہونے چاہئیں، اس معاملہ پر استقلال سے توجہ کرنے اور ان نقائص کو جو کالج کے نظم و نسق میں آپ پائیں نیچ و بن سے رفع کرنے کی ضرورت کا آپ کے خاطر نشین کرنا میرے لئے غیر ضروری ہے، کیوں کہ ایسا کرنے کا آپ نے مجھ سے پہلے ہی ارادہ ظاہر کیا ہے اگر آپ کی کمیٹی اپنی تحقیقات صداقت کے ساتھ اور بلا خوف نتائج انجام دے جیسا کہ مجھے یقین ہے کہ وہ انجام دے گی اور اگر آپ ان نقصوں کو جن کا کمیٹی کی تحقیقات سے انکشاف ہو دور کرنے کی تدبیر کریں گے تو مجھے امید ہے کہ برائی میں سے بھلائی جلوہ گر ہو گی اور آپ کا کالج اس پریشانی سے جو حال میں پیش آئی نکل کر اس خوش حالی سے جو اب تک اسے نصیب رہی نسبتاً زیادہ خوش حالی کے دور میں جنم لے گا۔"

طلبا کا خط آنریری سکرٹری کے نام اسی تاریخ کو طلبا کی کمیٹی کے سکرٹری نے الہ آباد سے ایک خط ارسال کیا جس میں بعض اخبارات کے اس واقعہ اور پولیٹکل معاملات میں رشتہ قائم کرنے پر اظہار افسوس کر کے ۱۸ مارچ تک کالج کھولے جانے کی درخواست کی۔

کمیشن کا کام ۱۲ مارچ سے کمیشن نے اپنا کام شروع کیا اسٹاف کے ممبروں اور طلبائے قدیم و حال نے تحریری و زبانی شہادتیں پیش کیں بعض جوشیلے اصحاب نے آنریری سکرٹری پر بھی الزامات قائم کئے اور ان کی کمزوریوں کو بیان کیا مسٹر محمد علی نے اپنے مضامین جو انگریزی اخبارات میں لکھے تھے اس بیان سے پیش کئے کہ وہ عرصہ دراز سے کالج کے ٹرسٹیوں اور اسٹاف کو موجودہ خرابیوں پر مطلع و متنبہ کرتے چلے آتے تھے، انہوں نے بعض ایسی باتیں بھی بیان کیں اور ایسے خطوط و کاغذات بھی پیش کئے جو بطور قومی راز کے امانت تھے۔

نواب محسن الملک کا استعفا اور اُس سے عام بے چینی

۲۱ مارچ کو یہ تحقیقات ختم ہو گئی اور اب نواب محسن الملک نے گزشتہ واقعات سے اضمحلال اور طبیعت کی زیادہ ناسازی کی وجہ سے استعفا پیش کر کے فوراً سبکدوش کئے جانے کی خواہش کی تاکہ سکون کے ساتھ کچھ دن آرام کریں لیکن موجودہ ٹرسٹیوں نے اُسی دن جلسہ کیا اور بکمال اصرار اُس کی واپسی پر زور دیا۔

یہ خبر جس وقت اخبارات میں شائع ہوئی تو ایک عام بے چینی پھیل گئی، انگریزی اور قومی اخبارات نے نواب صاحب کی خدمات پر تبصرہ و دلی رنج و افسوس کا اظہار اور ہر گوشۂ ہند کے مسلمانوں نے استعفا واپس لینے کے لئے اصرار کیا صدہا خطوط اسی مضمون کے موصول ہوئے، اُن اعلیٰ حکام کو بھی جو ایم اے او کالج کے ساتھ دلچسپی و ہمدردی رکھتے تھے تردد ہو گیا تھا چنانچہ لفٹنٹ گورنر پنجاب نے یہ خط لکھا کہ :۔

۳۱ مارچ ۱۹۰۶ء　　　کیمپ پنجاب　　　پرائیویٹ و کانفیڈینشل

"ڈیر نواب صاحب۔ مجھے نہایت افسوس ہے کہ آپ علی گڑھ کالج کی سکرٹری شپ سے مستعفی ہونے پر مجبور ہوئے، مجھے تو کچھ ایسا اندیشہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ اُن آرا و افکار کے غلبہ پانے کی علامت ہے جو آپ کی آرا و افکار سے جو دانشمندانہ اور سنجیدہ ہیں مختلف ہیں۔

اور یہ ایک ایسے ادارہ کے مستقبل کے لئے کچھ نیک فال سا نہیں معلوم ہوتا جس کو میں اب تک ہندوستان کے بہترین اداروں میں تصور کرتا تھا اور جو تمام ملتِ اسلامیہ کے لئے باعثِ نازش تھا۔

کل ہی بلوچیوں کے سرخیل مزاری نواب نے مجھ سے بیان کیا تھا کہ اُنھوں نے اپنے بھانجے (یا بھتیجے) کو علی گڑھ محض اسی لئے بھیجا تھا کہ وہاں طلبا اچھے طور طریقے سیکھتے ہیں اپنے بڑوں کی عزت اور ارباب نظم و نسق کا احترام کرتے ہیں اور حفظ مراتب

ملحوظ رکھتے ہیں۔

کیا آیندہ دس پانچ سال تک صورتِ حال یہی رہ سکے گی، میری دعا ہے کہ ایسا ہی ہو لیکن شاید ایسا نہو!"

آپ کا مخلص

ایبٹسن

واپسی استعفا غرض ہر جانب سے اور خاص کر ممتاز اصحاب کی طرف سے اصرار ہوا اور ایک بہت بڑے اعلیٰ طبقہ سے فیصلہ پر غور کرنے کی صلاح دی گئی کہ موجودہ نازک موقع پر ان کا علی گڑھ چھوڑنا بہت ہی بے وقت اور نامناسب ہے اس لئے اصرار عام اور حالات کالج کو ملحوظ رکھکر اُنہوں نے استعفا واپس لیا جس سے وہ عام بے چینی اور تردد رفع ہوگیا اور اخبارات میں عامۃً اظہار مسرت کیا گیا۔

اولڈ بوائز کا جلسہ ۲۰ مارچ کو اولڈ بوائز ڈنر ہوا قدیم اور حال کے طلبا پرنسپل اور ایک مہمان نے تقریریں کیں۔ پرنسپل نے اپنی اور اسٹاف کی طرف سے طلبا کے ساتھ صلح و صفائی کا اظہار کیا اور کہا کہ جو غلط فہمیاں ہو چکی ہیں ان کو فراموش کرنا لازم ہے اور از سر نو اسٹاف اور طلبا کے درمیان ہمدردی و اتحاد کا رشتہ قائم ہونا چاہیئے۔

مسٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے طلبا کی جانب سے پرنسپل کا شکریہ نہایت جوش سے ادا کیا اور ظاہر کیا کہ ہم اب تمام شکایتیں بھول گئے اور بدستور اطاعت و فرماں برداری کے لئے تیار ہیں۔

کمیشن کی رپورٹ ۲۶ مئی کو ٹرسٹیوں کے اجلاس میں کمیشن کی رپورٹ پیش ہوئی جس پر آٹھ ممبروں کے دستخط تھے۔

اس رپورٹ میں طلبا کی نافرمانی کے وجوہ

(۱) ممبران انگلش اسٹاف کے سوشیل برتاؤ کی تبدیلی۔

(۲) مضامین اخبارات جو ۱۹۰۴ء سے شروع ہوئے۔

(۳) مصطفے حسین رضوی کے معاملہ سے اس امر کا تیقن کہ شکایت کی سماعت نہیں ہوئی بلکہ ان کا بیان بھی مستوجب سزا ہے۔

(۴) وظیفہ[۵] پانے والوں کے نام کا اظہار۔

(۵) تحریری معذرت اور آنریری سکرٹری کے وعدہ کے بعد چھ[۶] اور طلبا کی سزا۔

(۶) غلام حسین کی سزایابی جس کو طلبا بے گناہ سمجھتے تھے۔

(۷) بوجہ اختلاف زبان طلبا اور اسٹاف کے مابین غلط فہمی۔

تسلیم کئے گئے اور یہ رائے قرار دی گئی کہ:-

(۱) باہم بے تکلف میل اور دوستانہ تعلقات اور برتاؤ ایک جانب سے اور دوسری جانب سے دلی مسرت کے ساتھ اپنے اُستادوں کی اطاعت و فرماں برداری ان دونوں قدیم روایات کو قائم رکھا جائے اور ان کا لحاظ کیا جائے۔

(۲) اصطلاح وظیفہ ترک کی جائے اور قرض حسنہ نام رکھا جائے۔

(۳) سنڈیکیٹ قائم کی جائے۔

(۴) بورڈنگ ہاؤس میں کتاب شکایات رکھی جائے۔

(۵) ٹیوٹوریل سسٹم جاری کیا جائے۔

(۶) پرنسپل اور آنریری سکرٹری کالج کے انتظامی معاملات میں ہمیشہ ایک دوسرے سے مشورہ کریں۔

(۷) ایک مہماں سرا بنائی جائے اور کوئی مہمان بورڈنگ ہاؤس میں نہ رہے۔

---

۵ یہ قاعدہ تھا کہ جن غریب طلبا کو امدادی وظائف ڈیوٹی سے دیئے جاتے تھے اُن کا نام افشا نہیں کیا جاتا تھا لیکن وظائف کا تعلق پرنسپل سے تھا۔

ان امور کے بعد کمیشن نے عام رائے یہ تحریر کی کہ :-

"شورش کی وجوہات اور اس قسم کے واقعات کے آئندہ تدارک کی تدابیر پر بحث کے بعد اب ہم یہ چاہتے ہیں کہ چند عام ریمارک بھی کریں۔ دو گواہوں کے تحریری بیانات کے، جو ہمارے سامنے پڑھے گئے، طرز بیان کی نسبت ہم اپنے سخت ناراضی کے اظہار کو بالکل جائز اور درست خیال کرتے ہیں اور اس طرز بیان کو بالکل ناحق اور نادرست سمجھتے ہیں۔ ہم اس امر کا بھی اظہار کرنا چاہتے ہیں کہ ہم کو اُن کی رایوں سے اختلاف ہے۔

طلبا کا طرزِ عمل ہماری رائے میں ناقابل حمایت ہے جیسا کہ فی الواقع خود اُن کو بھی معذرت نامہ پیش کرنے سے صاف دلی کے ساتھ تسلیم ہے۔

غلام حسین کی سزا کے احکامات یکے بعد دیگرے بالاقساط جاری ہونے سے متعلق طلبا کی شکایات کی بنا پر ضرور اُن کی غلط فہمی ہے۔ پرنسپل کی خواہش اوّل سے آخر تک یہی رہی کہ کانسٹبل پر حملہ آور ہونے کے الزام کے ناگوار نتائج سے غلام حسین کو بچایا جائے، لیکن واقعی ہم یہ نوٹ کرنا چاہتے ہیں کہ ہماری رائے میں پرنسپل نے آخر تک نہایت بے لوث اور خالص نیت کے ساتھ عمل کیا اور یہ کہ اُنہوں نے اپنے احکامات تا بحد یقین خود کالج کے جو اُن کے چارج میں ہے، فائدہ کی نیت سے جاری کئے تھے۔ ہم پرنسپل کی اِس نیک نیتی کے اعتراف سے باہر نہیں رہ سکتے کہ اُنہوں نے یہ سُن کر کہ آنریری سکریٹری نے یقین قطعی دلایا تھا کہ اگر طلبا معذرت پیش کریں گے تو سوائے غلام حسین کے اور کسی کو سزا نہ دی جائے گی، چھ (معتوب) طلبا کو بھی معاف کر دیا۔

ایک یہ خیال پایا جاتا ہے کہ موجودہ یورپین اسٹاف کے ایک ممبر کا برتاؤ

بعض اوقات درشت رہا ہے، ہم خیال کرتے ہیں کہ اُس کی بنا واقعہ پر ہے
ہم اپنی یہ رائے بھی جو خود اُس کے (ممبر یورپین اسٹاف کے بیان) پر مبنی
ہے، ضرور ظاہر کریں گے کہ ہمارے خیال میں اُس نے بورڈنگ ہاؤس کی
اندرونی زندگی کی طرف کافی توجہ نہیں رکھی، لیکن ہماری صلاح ہے کہ اس
معاملہ میں سوائے اس کارروائی کے جو پرنسپل مناسب سمجھ کر کرے
بالفعل اور کچھ نہ ہونا چاہیئے۔ ہماری یہ رائے ڈسپلن اور کالج کے مفاد
کے لحاظ سے ہے"

مرزا عابد علی بیگ صاحب اور نواب وقارالملک نے الگ الگ اختلافی نوٹ شامل کئے۔ مرزا صاحب نے ایک تمہید کے بعد لکھا تھا کہ:-

"کالج اسٹاف نے ٹرسٹیان جماعت حکمراں کی جگہ لے لی اور آنریری سکرٹری
کے ہاتھ کی وہ قوت جس میں عنان حکومت تھی کسی نہ کسی وجہ سے خواہ وہ وجہ
رسوخ کالج اسٹاف کی گورنمنٹ میں بلاواسطہ آنریری سکرٹری کے ہو یا
آنریری سکرٹری کی پالیسی ہی ایسی ہو کہ وہ خلاف مرضی کالج اسٹاف کے
کچھ کرنا نہ چاہے اگر سلب نہیں تو نہایت کمزور ہو گئی اور آنریری سکرٹری زیر
اطاعت کالج اسٹاف کے ہو گیا"

اُنہوں نے یہ رائے بھی دی کہ "مسٹر گاڈ ترپراؤن کو فوراً علیحدہ کیا جائے اور اس قدر تجربۂ عظیم کے بعد آیندہ تجربہ کی ضرورت نہیں۔

نواب وقارالملک نے مسٹر (مولانا) محمد علی کے مضامین کو اسباب شورش میں شامل کرنے سے اختلاف کیا، حالات اور ڈسپلن کے لحاظ سے مسٹر گاڈ ترپراؤن کی نسبت رائے دی کہ بالفعل یہ دکھلانے کے لئے کہ ان کی خدمات عہدہ پرووسٹی کو ناپسند کیا گیا، اس عہدہ سے علیحدہ کیا جائے اور اُن کا اضافہ جو یکم اپریل سے منظور

ہوا ہے روک دیا جائے اور ٹٹیوریل سسٹم میں ان کو کوئی حصہ نہ دیا جائے نیز دیگر اصلاحات میں ڈائننگ ہال کے انتظام کو انگلش ممبر اسٹاف سے نکال کر ہندوستانی ممبر کے سپرد کیا جانا تجویز کیا۔

ٹرسٹیز کمیٹی کا اجلاس

باوجودیکہ نواب محسن الملک نے اس اجلاس کی شرکت کے لئے خاص طور پر توجہ دلائی تھی مگر صرف اٹھارہ اصحاب نے شرکت کی۔ نواب صاحب اس زمانہ میں بمبئی میں تھے اور چونکہ زیادہ بیمار رہے اور بہت زیادہ ضعیف ہو گئے تھے، مشیران طبی نے آرام و سکون کی ہدایت کی تھی اس لئے شریک نہ ہو سکے۔

ٹرسٹیوں نے تقریباً تمام تجاویز مندرجہ اصل رپورٹ کمیشن کو منظور اور مرزا عابد علی بیگ اور نواب وقارالملک کی اختلافی رایوں کو نامنظور کیا۔

مسٹر گاڈ نر براؤن کا معاملہ پرنسپل پر چھوڑا گیا، طلبا کے رویہ پر اظہار ناپسندیدگی کے ساتھ ان کو سخت طور پر متنبہ کیا گیا کہ "آیندہ ڈسپلن کی خلاف ورزی کا افسران کالج کو نہایت سختی کے ساتھ تدارک کرنا پڑے گا"

پرنسپل کی سچی ہمدردی اور دلچسپی کا جو ان کو کالج کے ساتھ ہے اعتراف کر کے ووٹ آف کانفیڈینس پاس ہوا۔

نوٹ کمیشن نے اپنی رپورٹ میں حسب ذیل فقرہ بھی تحریر کیا تھا کہ:-

"ٹرسٹ کے موجودہ کانسٹی ٹیوشن کی نسبت یہ امر واقعہ ہے کہ ٹرسٹی شپ کے مین حیات ہونے سے متعلق بہت کچھ ناراضی ہمارے سامنے شہادت میں ظاہر کی گئی ہے۔ ہماری رائے میں ٹرسٹی کے منصب کا تاحیات ہونا ٹرسٹ کانسٹی ٹیوشن کا کوئی عیب نہیں ہے، لیکن نواب محسن الملک کی رائے ہے کہ آیندہ جو آسامیاں خالی ہوں اُن پر نئے ٹرسٹیوں کا تقرر پانچ سال کے لئے ہوا کرے اور نواب وقارالملک کا خیال ہے کہ مذکورہ بالا تجویز کے لحاظ سے (بقیہ نوٹ صفحہ آیندہ پر)

نواب محسن الملک پر اظہار اعتماد

تمام ٹرسٹیوں نے نواب صاحب کی خدمات کا اعتراف کیا اور جو الزام ان سے منسوب کیے گئے اُن سے اختلاف کرکے ووٹ آف کانفیڈینس پاس کیا اور حسب ذیل تار بھیجا کہ "ہم ٹرسٹیان موجودہ اجلاس واقع ۲۶ مئی ۱۹۰۶ء نہایت زور کے ساتھ آپ کی ان شاندار مفید اور مسلسل قومی خدمات کی نسبت دلی شکرگزاری اور احسان مندی کا اظہار کرتے ہیں جو آپ نے تمام قوم مسلمانان کی عموماً اور مدرستہ العلوم کی خصوصاً انجام دی ہیں اور آپ کے پیشوائے قوم ہونے پر کامل اعتماد کرتے ہیں اور نہایت خلوص سے آپ کی درازی عمر اور حصول صحت کی دعا کرتے ہیں۔"

نواب محسن الملک کے دل پر واقعات شورش کا اثر

"نواب[۱] محسن الملک بہادر کے دل پر گذشتہ فروری کے واقعات کالج نے ایک نہایت گہرا اثر پیدا کیا تھا اور اس زمانہ میں بعض موقعوں پر یہ معلوم ہوتا تھا کہ نواب محسن الملک اب بہت دنوں تک زندہ نہ رہیں گے ایک خاص موقع پر جب کہ تحقیقات کمیشن ہو رہی تھی وہ جلسے سے اٹھ کر دوسرے کمرہ میں آئے اور وہاں آکر ایک آرام کرسی پر ٹھنڈے سانس بھرتے ہوئے گر گئے اور کہنے لگے کہ پہلے ہی اس کم بخت دل میں زخم پڑے تھے اب اُن زخموں پر ...... اور نمک چھڑک دیا اب ہم زندگی سے تنگ آگئے ہیں۔ اس کے بعد سے پھر وہ ٹرسٹیوں یا کالج کے کسی جلسہ میں شریک نہیں ہوئے بمبئی تشریف لے گئے اور وہاں جاتے ہی بیمار ہوگئے۔"

(گذشتہ سے پیوستہ) موجودہ ٹرسٹیوں کو بھی پانچ برس کے لئے تصور کیا جائے لیکن ٹرسٹیز کمیٹی نے اس مسئلہ کو اتنا بھی قابلِ التفات نہ سمجھا کہ اس پر کوئی رائے ظاہر کی جاتی۔

[۱] اقتباس مضمون خان بہادر شیخ عبداللہ صاحب رسالہ خاتون اکتوبر ۱۹۰۷ء

یوں تو وہ عرصہ سے بیمار چلے آتے تھے بعض اوقات حالت بہت نازک ہو جاتی تھی مگر پھر قومی درد اُن میں طاقت پیدا کر دیتا تھا اور تازہ حوصلہ و عزم کے ساتھ مصروفِ عمل ہو جاتے تھے اس مرتبہ ان کے دل و جگر اور دماغ و روح پر ان واقعات کا بہت سخت اثر پڑا، ایک خط مورخہ ۲۰ مئی موسومہ حاجی عبداللہ جان صاحب وکیل سہارنپور میں لکھتے ہیں کہ :-

"آپ صاحبان سمجھ لیں کہ میرا رنج اور غم اور بیماری اب نہ جاوے گی جب تک میں کالج کا سکرٹری رہوں گا، بہت گالیاں کھائیں، بہت آفات سہے مگر نہ اب گالیاں کھانے کی طاقت ہے، نہ اپنے معزز ٹرسٹیوں کی طرف سے باضابطہ ذلیل ہونے کی ہمّت ہے اور نہ کالج کو جنگ و جدل کا اکھاڑہ بنانا منظور ہے ورنہ میں بھی سینہ میں دل اور مُنہ میں زبان اور ہاتھ میں قلم رکھتا ہوں، چُپ چاپ گالیاں سننا اور اپنے آپ کو باضابطہ اور علانیہ ذلیل ہونا گوارا نہیں کر سکتا مگر کم بخت مسلمان ایسے ہی بدنام ہیں میں کچھ بولوں تو پھر وہی زمانہ آجائے جو سید محمود کے زمانہ میں مرزا عابد علی بیگ صاحب نے پمفلٹ شائع کئے تھے اس لئے بابا میں نالائق ہوں مجھے نہ قوم کا درد نہ کالج کا درد نہ اپنے عہدہ کی عزت کی پروا نہ لڑکوں پر رحم، انگریزوں کا غلام اور بے ایمان، مگر کیوں ایسے شخص کو رکھتے ہو خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ ایسی حالت پر پہونچ گیا ہے کہ برداشت نہیں کر سکتا میں اُس وقت ایک خاص وجہ سے مجبور ہو گیا ورنہ میں اب ایک دن کے لئے سکرٹری رہنا منظور نہ کرتا اور اسی کا مجھے رنج ہے اور سچ پوچھو تو یہی میری بیماری ہے، اور میں بیماری کا مشکور ہوں کہ اُس نے اس زمانہ میں میری بڑی مدد کی اور دشناموں اور گالیوں کے اکھاڑے میں آنے سے روکا، خدا میری بیماری کو میری مدد کے لئے قائم رکھے تاکہ سامنے گالیاں کھانے سے بچا رہوں"

اسی طرح دوسرے خط مورخہ ۴ جولائی میں حاجی موسیٰ خان صاحب شروانی رئیس دتاولی کو لکھتے ہیں "کہ اب یہ وقت نہیں ہے کہ پچھلے معاملات اور پچھلی کارروائیوں کا ذکر کروں

کہ کیا اسباب پیش آئے اور کیا حالات تھے کہ جس سے وہ نتیجے پیدا ہوئے جو سب نے دیکھے میری جان تو بے حیا اور زندگی سخت تھی جو بچ گیا ورنہ مجھے حاجی صاحب وہ روحانی صدمہ ہوا کہ بلا مبالغہ اپنی عمر میں کبھی نہ ہوا تھا میری ساری محنت برباد گئی، میری ساری عزت جاتی رہی میری نسبت باضابطہ اور علانیہ وہ الزام لگائے گئے کہ ایک باعزت آدمی کے شرمانے کے لئے کافی تھے کاش میں مرجاتا اور کالج کو منہ نہ دکھاتا تو بہت اچھا ہوتا مگر ابھی قسمت میں آخری عمر میں کچھ اور سننا اور دیکھنا منظور ہے کہ پھر آتا ہوں اور چند روز کام کرنا اور رنج اور صدمہ اٹھانا پڑے گا۔"

سکرٹری شپ کی تبدیلی کی خواہشیں

ادھر یہ حالت تھی اور دوسری طرف بعض اصحاب سکرٹری شپ کے اُمیدوار تھے، مولانا محمد علی، نواب وقار الملک پر زور ڈالے رہتے تھے کہ وہ اس عہدہ کے لئے کھڑے ہوں اور طرح طرح سے آمادہ کرتے تھے قوم کا واسطہ اور غیرت دلاتے تھے، چنانچہ اپنے خط مورخہ ۱۵ جولائی میں لکھتے ہیں کہ:۔

"حاجی سمٰعیل خاں صاحب نے تو ابھی سے یونین جیک اُڑانا شروع کر دیا ہے وہ گورنمنٹ کے سایہ عاطفت میں کالج کی سیڑھیوں پر قدم رکھ رہے ہیں چند جوانانِ سعادت مند خود اسی انتظار میں ہیں۔۔۔۔۔۔ ایسے وقت میں صرف اس خیال سے کہ قوم آپ کو خودغرض سمجھیگی۔ آپ کو ذاتی منفعت کے لئے کوشاں سمجھے گی اس بار کے اٹھانے سے جھجکنا ایک ایسا بڑا گناہ ہوگا جو آپ کی تمام عمر کی قومی خدمت کو ہمارے دل سے بھلا دے گا، سرسید سے

زیادہ تو کوئی مطعون نہیں ہوا ہوگا کالج کی بنا کرتے وقت کونسا شبہ ایسا نہ تھا جو اُن پر نہ کیا گیا ہو"۔

لیکن یہ سب خود غرضیاں اور جوشش تھے نہ نواب وقار الملک کھڑے ہوئے اور نہ دوسرے امیدوں میں کامیاب ہوئے اور نواب محسن الملک کے ہی شانوں پر یہ بار رہا اگرچہ تین ماہ بعد قدرت نے راستہ صاف کر دیا۔

واقعات پر مختصر تبصرہ

کالج کا مقصد اساسی سیاسی مطمح نظر اس کی پولیٹکل حیثیت یورپین اسٹاف کے اختیارات و اقتدارات حکومت کے اثرات ٹرسٹیز کے حالات اولڈ بوائز میں دو متحارب جماعتیں یہ سب امور نواب محسن الملک کے قابو سے باہر تھے اس پر سب سے زیادہ کالج کی متزلزل حالت باعث تردد تھی۔

اِن حالات میں وہ کوئی ایسی پالیسی اختیار کرنا پسند نہ کرتے تھے جس کا فائدہ مشتبہ اور ضرر یقینی ہو، اُنہوں نے اصل کمزوری کو بخوبی سمجھ لیا تھا اور کم از کم مخالفت کی لائن اختیار کر لی تھی، اگر ان کے رفیقان کار مضبوط ہوتے قوم میں وہ عزم اور فیاضی ہوتی جو نقصان کا بدل ہو سکتی اور وہ اولڈ بوائز جو صرف زبان و قلم ہی سے کام لینا اور ہر وقت آنریری سکرٹری پر حکومت جتانا ہی جانتے تھے مصلحت اندیشی اور بے لوثی سے مدد دیتے تو ساری مشکلات آسان ہو جاتیں۔

بہرحال اِس فاسد مادہ کا پھوٹ جانا بھی بہتر ہوا اور آئندہ کے لئے راستہ صاف ہو گیا اس واقعہ کے سلسلہ میں اخبار ٹریبون لاہور نے کس قدر جامع تبصرہ کیا ہے کہ

ٹریبون لاہور کا ایک اقتباس

نواب محسن الملک کے استعفٰے کی خبر نہ صرف اُن کے دوستوں ہی میں سخت قلق و افسوس کے ساتھ سُنی جاوے گی بلکہ عام طور پر پبلک بھی اس کو نہایت افسوس سے سُنے گی

جس نے حقیقی طور پر اُس شخص کا ایثار دیکھا ہے اُس نے اپنی زندگی کو قوم کی بہبودی کے لئے مخصوص کر دیا۔ حالاں کہ اب وقت تھا کہ وہ اپنے دوستوں اور عزیزوں کی سوسائٹی میں آرام کرتا، مگر اس نے عین اس موقع پر جب کہ کوئی شخص مرحوم سر سید کے مقدّس مشن کو سنبھالنے کے قابل نہ تھا سکرٹری شپ کے عہدہ کو قبول کر کے ضرورتِ وقت کو پورا کیا۔ سکرٹری شپ کے زمانہ میں اُس نے کالج کے وقار اور اعزاز کو بڑھایا۔ باین کبرسنی کالج کی مالی حالت کو سُدھارنے کے لئے اُس نے ہندوستان کے دور دراز حصص میں دورے کئے، نئی عمارتیں بن گئیں، سنئے وظائف قائم ہوئے اور نئی پروفیسریاں قائم کی گئیں اور یہ سب کچھ اُس نے اُس حالت میں کیا جب کہ اُس کو کوئی مدد نہیں ملی، بلکہ زیادہ موزوں ہوگا اگر ہم یہ کہیں کہ مخالفتوں کے طوفان میں اُس نے یہ سب کچھ انجام دیا۔ ہندوستانی زندگی کا مواد فاسد ایک اندرونی وبال ہے جو علی گڑھ کالج کے معاملات میں مجسم پایا جاتا ہے کہا جاتا ہے کہ نواب انگلش اسٹاف کے اشاروں پر چلتا ہے اور اکثر سربرآوردہ اور روشن خیال مسلمان یہ کہنے میں بھی تامل نہیں کرتے کہ نواب موصوف نے اپنا اعتبار کھو دیا ہے لیکن وہ اصحاب جو محمڈن کالج کے معاملات سے آگاہی رکھتے ہیں، نواب صاحب کے حق میں انصاف کریں گے اگر وہ یہ تسلیم کریں کہ باوصف اپنے مشیروں کی مخالفت اور برائے نام دوستوں کی ملامت کے اُس نے کالج کے ایگزکٹو افسر ہونے کی حیثیت سے عجیب کامیابی حاصل کی ہے اگر نواب صاحب کو اپنے جلیسوں کی طرف سے کچھ بھی مدد ملتی تو وہ گورنمنٹ اور کالج کے انگلش اسٹاف کے اثرات کو بہت کچھ کم کر دیتے۔ ان حالتوں میں اُن کی ذمہ داریاں نہایت مشکل اور کٹھن تھیں اور یہ تعجب نہیں ہے کہ انہوں نے کوئی زیادہ بہتری کالج کو نہیں پہنچائی بلکہ یہ تعجب ہے کہ انہوں نے موجودہ فرائض کو اس خوش اسلوبی سے کس طرح

انجام دیا اگر ان کا استعفا منظور ہو گیا تو اُن کی جانشینی کا مسئلہ نہایت دقت طلب ہو گا۔ بہر حال اُن کا کوئی بھی جانشین کیوں نہ ہو وہ یقیناً نہایت خوش نصیب ہو گا اگر وہ اُن اعلیٰ کارہائے نمایاں کی نیک نامی کا دسواں حصّہ بھی حاصل کر سکے جو نواب صاحب نے سرانجام دئے ہیں اور کثیر مجمع احباب اور اپنے مدّاحوں کی بہترین تعریفات ساتھ لے کر علیحدہ ہوتے ہیں۔"

ایّامِ آخرین

علالت و وفات

صحت کی عام حالت نواب محسن الملک کی صحت عرصہ سے خراب تھی کالج کی سکرٹری شپ اور قومی رہنمائی کے بار نے اور بھی بُرا اثر ڈالا تھا ذیابیطس کی پرانی شکایت تھی اسی میں تکلیف بہت بڑھ گئی تھی گزشتہ چند سال انتہائی محنت میں گذرے تھے اور اگرچہ اُس کے شاندار نتائج سے دل قوی ہو گیا تھا لیکن واقعات شورش نے زبردست ردعمل کر دیا اور امراض کے شدید حملے شروع ہو گئے ناچار بمبئی جانا پڑا جہاں مشیران طبّی نے اصرار کے ساتھ کام کی سخت ممانعت کی، مگر کام کے بغیر تو چین ہی نہ تھا۔

بھائی کی موت اسی عرصہ میں بڑے بھائی سید غلام عباس[۱] صاحب کی بیماری کی اطلاع ملی بے چین ہو گئے اور ۷ استمبر کو بمبئی سے روانہ ہو کر اٹاوہ آئے، ۲۰ ستمبر کو اُن کا انتقال ہو گیا، اس صدمہ نے دل بٹھا دیا رہی سہی طاقت سلب ہو گئی، لاش جب قبر میں اُتاری گئی تو آہ کر کے بیہوش ہو گئے، ہوش آیا تو

[۱] ستتر برس کی عمر میں انتقال کیا نہایت نیک اور دیندار بزرگ تھے۔

صبر جمیل کیا اور پس ماندوں کی تسلّی کی۔

شملہ کو روانگی ۲۲ ستمبر کو اٹاوہ سے روانہ ہو کر ایک ایک دن علی گڑھ اور لکھنؤ ٹھیرتے ہوئے شملہ گئے۔

مصروفیتیں یہاں اصلاحات کی اسکیم میں مسلمانوں کے حقوق کی توسیع وغیرہ کے لئے کوششیں شروع کی ۲۹ ستمبر کو ہز اکسلنسی ویسرائے[۱] سے انہیں اغراض کے لئے ملاقات کی اور بھی اعلیٰ حکام سے ملاقاتیں ہوئیں اور اہم قومی و سیاسی معاملات پر گفتگوئیں رہیں۔

مرض کا حملہ اور انتقال یہ سب کچھ ہو رہا تھا مگر شمع حیات جھلملا رہی تھی آغاز اکتوبر میں سرخ بادہ کا دورہ ہوا چہرہ، سر، گردن پر ورم آگیا، حضور ویسرائے نے اپنے خاص ڈاکٹر کو علاج کے لئے مامور کیا دو بار عمل جرّاحی کی نوبت آئی لیکن افاقہ نہ ہوا اور حالت ردّی ہوتی چلی گئی۔ ۱۴ اکتوبر کو جب کہ ابھی ہوش و حواس قائم تھے اس راسخ العقیدہ مومن اور خدا و رسول پر یقین کامل رکھنے والے مسلمان نے اپنے دوستوں اور ملازموں کو جو خدمت میں حاضر تھے گواہ کر کے کہا کہ ''مجھے اب اپنی زندگی کا اعتبار نہیں آپ سب گواہ رہیں کہ میں صدقِ دل سے کلمہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ پڑھتا ہوں، میں نے جو کچھ ملک و قوم کی

---

[۱] ۱۹۰۸ء میں لارڈ منٹو نے اس ملاقات کے متعلق کالج وزٹ کے موقع پر اپنی تقریر میں کہا تھا کہ ''مجھے معلوم ہے کہ آپ کے ممتاز اور نہایت ہر دلعزیز سابق سکرٹری نواب محسن الملک کو میرے یہاں آنے کی کس قدر آرزو تھی، کاش میں اُن کے زمانے میں یہاں آیا ہوتا، لیکن یہ بات شدنی نہ تھی اپنی رحلت سے چند دن پہلے وہ شملہ پر میرے کمرہ میں بیٹھے تھے اور (اُس وقت کے لحاظ سے) میں جانتا ہوں کہ وہ امور ان کو کس قدر عزیز تھے جن سے یہاں آپ کو تعلق ہے آپ نے سچ کہا ہے کہ اس کالج کے جلیل القدر بانی کے وہ دست راست تھے اور اپنی کوششوں اور مثال کو اس کالج کے لئے انہوں نے ایک بیش بہا ورثہ چھوڑا ہے۔

خدمات کی ہیں وہ نیک نیتی کے ساتھ کی ہیں اور اگر ان میں کوئی غلطی واقع ہوئی ہو تو میں بے قصور ہوں کیوں کہ میری نیت ہر حال میں نیک تھی اور خدا میری نیک نیتی کا شاہد ہے"، رات کو غفلت طاری ہوگئی اور دوسرے دن ۸ رمضان ۱۳۲۵ھ ۱۶ اکتوبر ۱۹۰۶ء کو ۶ بجے شام کے وقت داعی اجل کو لبیک کہا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

حالی

جس وقت کا دھڑکا تھا وہ وقت آگیا آخر — یاروں پہ مصیبت کا سماں چھا گیا آخر
وہ ملک کا محسن وہ مسلمانوں کا غم خوار — سر کرکے مہم قوم کے کام آگیا آخر
سید کا بدل قوم کو مشکل سے ملا تھا — اس کو بھی وہی قوم کا غم کھا گیا آخر

لاش کی روانگی انجمن شبان المسلمین کے ممبروں نے تجہیز و تکفین اور دیگر انتظامات میں انتہائی عقیدت سے شرکت کی، صبح ہوتے ہوتے جنازہ تیار ہو گیا ایک وسیع میدان میں نماز ہوئی، تقریباً تمام مسلمانان شملہ شریک تھے، چوں کہ لاش اٹاوہ میں دفن ہونے والی تھی اس لئے تابوت میں رکھی گئی، تابوت پر ایک دوشالہ تھا اور اس پر پھولوں کے ہار چھائے ہوئے تھے، یہ تابوت ریلوے ٹرین میں روانہ ہوا اور (مرحوم) مولوی غلام محمد صاحب شملوی[۵۲] تابوت والی گاڑی میں قرآن خوانی کرتے ہوئے کالکا تک آئے۔

---

[۵۱] نواب صاحب چند دن تک سیسل ہوٹل میں قیام پذیر رہے تھے جب مرض میں زیادتی ہوئی تو بابو عبدالاحد صاحب رئیس شملہ کی کوٹھی میں منتقل ہو گئے اور یہیں انتقال کیا۔ بابو صاحب نے پوری دلسوزی سے خدمت کی اور دامے، درمے، قدمے انہیں آرام پہونچانے میں مستعد رہے۔

[۵۲] نہایت پُرجوش کام کرنے والے تھے عالم تھے اور اُن کے وعظ میں خاص تاثیر تھی جب سے ندوہ قائم ہوا اپنی زندگی اس کی خدمت کے لئے وقف کردی ۱۹۳۴ء میں انتقال ہوا۔

مدرسۃ العلوم میں تدفین

آخری سانس ختم ہوتے ہی شملہ سے یہ حسرتناک خبر تمام ہندوستان میں پہونچ گئی کالج کے ٹرسٹیوں کو اطلاع دی گئی کہ "نواب صاحب کی وصیت کے مطابق لاش اٹاوہ میں دفن کی جائے گی"، اس اطلاع پر مقامی ٹرسٹیوں نے فوراً میٹنگ منعقد کر کے ایک رزولیوشن میں مرحوم کی خدمات کے پُرجوش اعتراف کے ساتھ قرار دیا کہ :۔

"سرسید کے پہلو میں دفن کئے جانے کا حق اُن سے بڑھ کر اور کس کو ہو سکتا ہے اگر نواب صاحب مرحوم نے کوئی وصیت اٹاوہ میں دفن کئے جانے کی نسبت کی ہے تو اس کی وجہ غالباً یہ ہوگی کہ خان بہادر زین العابدین خاں[1] مرحوم کے دفن کئے جانے کے بعد خاص وجوہ سے یہ رزولیوشن پاس کیا گیا تھا کہ آیندہ کوئی شخص کالج میں نہ دفن ہونے پائے اس رزولیوشن کا علم نواب صاحب مرحوم کو تھا اُنہوں نے اس خیال سے کہ مدرسۃ العلوم میں میرے دفن کئے جانے کی نسبت شاید کوئی دقّت ہو اگر اس قسم کی وصیّت کر دی ہو تو تعجب نہیں مگر اُن کی حالت خاص ہے اُن کی ذات پر اس رزولیوشن کا کوئی اثر نہیں ہونا چاہئے مدرسۃ العلوم کی نہایت بدقسمتی ہوگی اگر ان کی لاش کسی اور جگہ دفن کی جائے، اُنہوں نے تمام زندگی مدرسۃ العلوم اور قوم کی خدمت میں قربان کی اور وہ مرتے دم تک بس اسی ایک دھن میں لگے رہے اس لئے ان کی لاش یہیں دفن ہونی چاہئے ان کا وجود محض ایک شخصی وجود نہیں ہے بلکہ ایک قومی وجود ہے اس لئے اُن کی لاش کے دفن کئے جانے کی نسبت رائے دینے کا سب سے بڑا حق قوم کو ہے اور مدرسۃ العلوم کی سرزمین اس بات

---

[1] سرسید کے خاص دوست تھے ۱۹۰۶ء میں انتقال ہوا تو اُن کے صاحبزادوں نے ٹرسٹیوں کی اجازت بغیر سرسید کی قبر سے چند فٹ فاصلہ پر دفن کر کے مقبرہ بنا دیا۔

کا استحقاق رکھتی ہے کہ جس شخص نے اپنی زندگی اس کی خدمت میں قربان کر دی اُس کی لاش اُس ہی کی گود میں دی جائے ؟"

۱۷ اور ۱۸ اکتوبر کی درمیانی شب میں ۲ بجے لاش علی گڑھ پہونچی اسٹیشن پر اعیان کالج اور طلبار موجود تھے، حجت و تکرار کے بعد ٹرین سے تابوت والی گاڑی کاٹ لی گئی مگر نواب صاحب کے اعزّا کا اصرار تھا کہ لاش آمادہ جائے گی، نواب وقار الملک بھی جو اس سانحہ کی اطلاع پا کر فوراً امروہہ سے روانہ ہوگئے تھے دس بجے دن کو آگئے، اُن کے سامنے وصیّت کی تحقیقات کی گئی اور جب یہ محقّق ہوگیا کہ کوئی وصیّت نہیں تو گاڑی سے تابوت اُتار کر کالج میں لایا گیا نماز جمعہ کے بعد نماز جنازہ ہوئی۔ سر سید اور مولوی زین العابدین خاں کی قبروں کے درمیان دفن کئے گئے۔

طلبا نے آخری اُمید پوری کی

نواب محسن الملک کو خدا نے دو بیویوں[۱] میں پہلی بیوی سے ایک فرزند سید مظہر علی کی خوش نصیب کی تھی جن کے ریعان شباب تک پہونچنے سے پہلے ہی ۱۸۶۳ء میں وہ خوشی داغ جگر سے مبدل ہوگئی لیکن خدا نے قوم کے تمام بچّوں کی اُمید

---

[۱] پہلی بیوی بنت عم تھیں جن سے عنفوان شباب میں شادی ہوئی تھی لیکن وہ مذہب شیعہ میں انتہائی غلو رکھتی تھیں اس لئے نواب صاحب کے عقائد کی تبدیلی اور آیات بینات کی تالیف سے خانگی زندگی میں تلخی آگئی تھی نواب صاحب کی رواداری و کوشش کے باوجود جب اس میں کمی نہیں ہوئی تو مجبوراً اُن کو دوسرا عقد کرنا پڑا ان بیوی کا نام "نور جہاں بیگم" تھا کشمیر کے معزز خاندان سے تھیں، ظاہری حسن و جمال کے ساتھ خوش سلیقگی و نفاست بھی بدرجۂ اتم تھی، فارسی میں پوری دستگاہ تھی انگریزی بھی جانتی تھیں وسیع الاخلاق تھیں اور اُنہیں شوہر کے آرام و آسائش کا ہر وقت اور بے انتہا خیال رہتا تھا حقیقی معنوں میں وہ ان کی رفیق زندگی اور سکینہ تھیں دوران علالت میں شملہ نہ پہونچ سکیں۔ علی گڑھ قبر پر فاتحہ کے لئے آئیں اور اس سانحہ کے چار ماہ بعد فروری ۱۹۰۸ء میں رحلت کی

وخوشی نواب محسن الملک کے وسیع قلب میں بھر دی تھی، اُنھوں نے اپنی رحلت سے سات مہینے پہلے شورش طلبا کے زمانہ میں جو تین خط لکھے تھے ان میں سے ایک خط میں یہ فقرہ بھی تھا کہ ”خدا میرے عزیز طالب علموں کی عمر دراز کرے اور ان کو بااقبال کرے وہ قوم کے فخر ہوں وہ میرے مرتے وقت اپنے سعادت مندانہ عمل سے تسلّی دیں میرا جنازہ اُٹھائیں اور اپنے ہاتوں سے مجھے دفن بھی کریں میرے کوئی اولاد نہیں ہے میرے کوئی بچہ نہیں، مگر جتنے لڑکے مسلمانوں کے یہاں ہیں وہ میرے بچے ہیں گو وہ مجھے اپنا نہ سمجھیں مگر میں ان کو اپنا جگر گوشہ اور پارۂ دل سمجھتا ہوں اور یہ بھی اُمید رکھتا ہوں کہ مجھے اپنے ہاتوں سے اسی زمین میں دفن کریں اور مٹی کے ڈھیلے میری قبر پر اپنے پیارے ہاتھ سے رکھیں“۔

اب آٹھ ماہ بعد ان کی یہ اُمید پوری ہوئی ان جگر گوشوں نے سپرد خاک کیا اور پارہ ہائے دل نے مٹی کے ڈھیلے قبر پر رکھے۔

وداعیہ اے کالج[۱] کی مبارک زمین مسجد دیکھ آج قوم کا جگر گوشہ اپنی زندگی کے مرحلے طے کر کے تجھ میں پناہ لیتا ہے دیکھ تیرے پاس ہماری قوم کے دو لعل بے بہا اور بھی دفن ہیں آج ایک تیسرا گوہر شب چراغ اور آتا ہے یہ اُس خفتہ بخت، حرماں نصیب قوم کی تین عزیز امانتیں ہیں جو تجھے داور محشر کے سامنے پیش کرنی ہوں گی، یہ ہماری آنکھوں کے تارے تھے جو آج تجھ میں مدفون ہیں لیکن یہ غروب ہو کر بھی اپنی روشنی چھوڑ گئے ہیں اور حشر میں پھر چمکیں گے، اے روشنی جا، اے قوم کے تارے جا اور وہاں جا کے سو جا جہاں قوم کے آفتاب و مہتاب پڑے سو رہے ہیں، شام ظلمت آپہونچی ہے تاریکی چھا رہی ہے اب اور تارے نکلیں مگر تیری چمک کسی میں نہ ہوگی جا اب عالم لقبا

---

[۱] مولوی عبدالحق صاحب بی اے علیگ معتمد انجمن ترقی اُردو پروفیسر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن (دکن ریویو ۱۹۰۷ء)

میں جا، تیرا آنا مبارک ہوا خدا تیرا جانا بھی مبارک کرے، تجھ پر ہزاروں درود اور سلام ہوں اور تجھ پر تا قیامت خدا کی رحمتیں نازل رہیں۔

تعزیت کے پیغامات اور جلسے وغیرہ

نواب محسن الملک کی پنجاہ سالہ قومی خدمات اور فضائل و کمالات کا قدرتی تقضا تھا کہ ان کے انتقال کی خبر سے ہر جگہہ اور ہر طبقہ میں رنج والم کے جذبات پیدا ہوں مسلمانوں کو اپنے محسن و رہبر کی وفات سے خاص کر ایسے وقت میں جب کہ سیاسی مستقبل کے لئے اُن کے تدبر و ذہانت اور فراست کی سخت ضرورت تھی نہایت سخت صدمہ اور نقصان پہنچا، ہر گوشہ ملک میں تعزیتی جلسے منعقد ہوئے، ایصال ثواب کے لئے فاتحہ خوانی ہوئی اور رنج و غم کا اظہار کیا گیا، مسلمان والیان ملک نے اس کو قومی حادثہ سمجھا اور قوم کے ساتھ اظہار ہمدردی کیا۔ ویسرائے ہند اعلیٰ حکام افسران تعلیم اور مقتدر لوگوں نے تعزیتی تار اور خطوط بھیجے، تمام پیغامات تعزیت میں سب سے اہم پیغام اعلیٰ حضرت حضور نظام آصف جاہ سادس میر محبوب علی خاں غفراں مآب کا تھا جو حضور ممدوح الشان کے معتمد پیشی کی وساطت سے موصول ہوا جس سے یقیناً مرحوم کی روح کو ابدی تسکین ہوئی ہوگی۔

حضور نظام کا پیغام تعزیت

حضور نظام نے نہایت ہی رنج کے ساتھ اپنے قدیم ملازم محسن الملک بہادر کے انتقال کی افسوسناک خبر سُنی اور مجھے حکم دیا ہے کہ میں آپ سے درخواست کروں کہ آپ مہربانی سے ٹرسٹیاں، اسٹاف اور طلبائے مدرسۃ العلوم کو ہز ہائینس کی دلی تعزیت اُن کے اس عظیم نقصان کی بابت پہنچادیں۔

میں یہ بھی اطلاع دیسکتا ہوں کہ نواب مرحوم نے جو ملکی خدمات حیدرآباد کی اور جو تعلیمی خدمات مسلمانوں کی انجام دی ہیں اُن کی نسبت اظہار پسندیدگی کے طور پر ہز ہائینس نے تین سو روپیہ ماہوار وظیفہ تاحین حیات نواب صاحب مرحوم کی بیوہ کے لئے پہلے ہی

منظور فرما لیا ہے۔

ان بے شمار خطوط میں سے جو تعزیت میں موصول ہوئے بمبئی و پنجاب کے گورنر اور لفٹننٹ گورنر کے دو خطوط کے ترجمے بھی درج کئے جاتے ہیں جن سے اندازہ ہو گا کہ نواب محسن الملک کا کیسا وسیع اثر تھا اور وہ اس حالت ضعف و صدمہ کے باوجود کیسے ضبط و استقلال سے مصروف عمل تھے۔

سر لزلی گورنر بمبئی

آج میں نے نہایت ہی قلق کے ساتھ اپنے پیارے پرانے قدیم دوست نواب محسن الملک کی وفات کی افسوس ناک خبر پڑھی، نواب مرحوم ایک یا دو ہی روز قبل روانگی شملہ ہم سے ملنے آئے تھے، کیا خبر تھی کہ ان سے دوبارہ ملنے کی اُمید غلط ہو جائے گی۔ ان کی وفات سے مسلمانان ہند کا بزرگ پیشوا اُٹھ گیا اور اب اُس کی جگہ پُر کرنی نہایت مشکل ہو گی، اُن جیسا ہمدرد ملک اور عالی خیال شخص ہر قوم کے لئے ایک عزیز مثال ہے اور مجھے یقین ہے کہ اگرچہ اُن کی وفات اس خاص قوم کے لئے جس کے وہ ایسے بیش بہا ممبر اور ممتاز زیور تھے گراں تر صدمہ ہے مگر حقیقت میں اُن کی موت سے تمام قوموں اور ملتوں کا ایک دانا دوست جاتا رہا اور تمام ہندوستان اُن کی بے وقت وفات پر گریہ و زاری کرے گا۔

میری درخواست ہے کہ ان کے خاندان کو میری دلی ہمدردی جو مجھے اس صدمہ عظیم میں ان کے ساتھ ہے پہنچا دیجئے اور اگر اب یا اس کے بعد اُن کی کوئی یادگار قائم کرنے کا فیصلہ ہو تو میں نہایت خوشی کے ساتھ اس میں چندہ دوں گا خواہ کسی شکل میں وہ یادگار قائم کی جائے (۱۷ اکتوبر)

سر چارلس ڈنزل ایبٹسن لفٹننٹ گورنر پنجاب

میرے دوست آرچبولڈ، میں علی گڑھ میں آپ کے سوا کسی اور سے واقف نہیں جس کو یہ خط بھیج سکوں اُمید ہے کہ آپ اُس کو ٹرسٹیوں کی جماعت تک پہنچا دیں گے،

میں ان پر یہ بات ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ نواب محسن الملک کی اچانک موت سے مجھے انتہائی صدمہ ہوا۔ یہ خبر پہلی مرتبہ مجھے اپنے کیمپ میں ملی جو ایک غیر متوقع صدمہ کی طرح تھی کیوں کہ ابھی تھوڑا ہی عرصہ گذرا کہ وہ مجھ سے ملنے کے لئے آئے تھے دیر تک اُن سے گفتگو رہی جو بہت دلچسپ اور حسب معمول نصیحت آمیز تھی اُس وقت وہ بالکل تندرست نظر آتے تھے، میں یہ اس وجہ کہ میرا صوبہ ہندوستان کے صوبوں میں وفادار مسلمانوں کے لحاظ سے دوسرے نمبر پر رہے اور میں علی گڑھ کالج کو ایک معمولی پراونشیل انسٹیٹیوشن کی حیثیت سے زیادہ سمجھتا ہوں اور یہ کہ مرحوم نواب میرے ذاتی دوست تھے جن کی دوستی کی میں انتہائی قدر کرتا تھا اور جس سے میں نے استفادہ کیا اس بات کے کہنے کا حق رکھتا ہوں کہ اُن کی موت کالج کے لئے جس کے انتظامات میں وہ نمایاں حصّہ لیتے تھے اور مسلمانوں کے لئے جن کے مفاد کی اُن کے دل میں پہلی جگہہ تھی اور گورنمنٹ کے لئے جس کے وہ ہمیشہ وفادار رہے ہیں یکساں نقصان ہے، (۲۰ اکتوبر)

ماتمی نظمیں اس سانحہ پر ہندوستان کے ہر حصّہ میں ہر طبقہ کے شعرا نے عربی، فارسی اُردو میں مرثیے، قطعے، مسدّس، رباعیاں اور تاریخ ہائے وفات لکھکر اپنے جذبات کا اظہار کیا، اگر ان سب کو جمع کیا جاوے تو ایک ضخیم جلد ہو سکتی ہے لیکن اس باب کے خاتمہ پر مولانا حالی کی رباعیاں بطور یادگار شامل کی جاتی ہیں، جن میں محسن الملک کی تمام قومی زندگی کا عطر بھرا ہوا ہے۔

رباعیات حالی

(۱)

دم بھر نہ کبھی جان کو آرام دیا — خدمت کے لئے قوم کی مر مر کے جیا
پیری ہوئی سدراہ اس کی نہ مرض — صدیوں کا تھا جو کام وہ برسوں میں کیا

(۲)

پیری میں جوانوں کو کیا مات اُس نے — آرام پہ اپنے مار دی لات اُس نے
تدبیر سے محنت سے دکھا دی سب کو — کالج کی ترقی میں کرامات اُس نے

(۳)

مدراس میں سوتوں کو جگایا جاکر — غُل علم کا برہما میں مچایا جاکر
چھائی ہوئی مُردنی جہاں قوم میں تھی — وہاں آبِ حیات اُن کو پلایا جاکر

(۴)

مہدی سے گئی نہ دل سے کالج کی لگن — یہاں تک کہ ہوا اُس کے کفن زیبِ بدن
پورا کیا جیسے پال نے دینِ مسیح — اُس نے یوں ہی پورا کیا سیّد کا مشن

(۵)

بے عذر ہر ایک کام انجام دیا — تھکنے کا نہ بھول کر کبھی نام لیا
جو کام پہ اُس کے نکتہ چیں تھے شب و روز — دی جان اُنہیں کے کام میں کام کیا

(۶)

جو قوم کی دوستی کا دم بھرتے ہیں — خدمت پہ وطن کی ناز جو کرتے ہیں
مہدی سے وہ سیکھ لیں کہ اس کو کہتے ہیں — یوں رہتے ہیں یوں جیتے ہیں یوں مرتے ہیں

(۷)

مر کر مہدی نے زندگانی پائی — جی کھو کے جزائے جانفشانی پائی
زندہ تھے تو چند روزہ مہماں تھے یہاں — جب مر گئے عمرِ جاودانی پائی

(۸)

ہیہات وہ تعلیم کا حامی مہدی — سیّد کا وصی قوم کا ہادی مہدی
برسوں یہ صدا رہے گی کالج میں بلند — مہدی، مہدی دریغ مہدی مہدی

تاریخ وفات ان بے شمار تاریخوں میں جو اس واقعہ پر لکھی گئیں سب سے اچھی تاریخ "یغفرلہ" ۱۳۲۵ھ ہے یہ مادہ ایک ہی وقت میں متعدد اصحاب نے نکالا جو مختلف صوبوں میں تھے، سرسید کا تاریخی مادہ "غفرلہ" ۱۳۱۵ ہے اس مادہ میں صرف حرف (ی) کا اضافہ کر دینے سے تاریخ نکل آئی۔ قطعات تاریخ میں بہترین قطعہ[1] جس کو مولانا حالی نے پسند کر کے شائع کرایا یہ ہے کہ:۔

محسن الملک آہ زد نیا برفت — خلق شد از رحلتش اندوہ گیں
سال وفاتش شدہ ملہم زغیب — انجمن آرائے بہشت بریں
۲۵ ۱۳ ھ

نواب محسن الملک
کے
اخلاق و خصائل اور عادات و شمائل

نواب محسن الملک غریب گھر میں پیدا ہوئے۔ قدیم طرز کی تعلیم پائی اور سترہ اٹھارہ برس کی عمر میں علوم متداولہ کی تکمیل کر لی، انگریزی حکومت میں دس روپیہ مہینہ کی نوکری سے سلسلہ ملازمت کا آغاز ہوا اور ملازمت سرکار عالی نظام میں تین ہزار روپیہ ماہوار تک ترقی ہوئی، ایک بڑے ملک کے نظم و نسق کو درست کیا۔ مہدی علی سے نواب محسن الدولہ، محسن الملک، منیر نواز جنگ بہادر ہوئے، ان کا دل نیکی، قومی محبت اور انسانی ہمدردی کا سرچشمہ تھا، قومی خدمت سے قوم کے سردار و سرتاج بنے اور اپنے عمل و کردار سے اپنے آپ کو سید القوم خادمھم کا صحیح مصداق ثابت کیا۔

---

[1] مصنف نے اپنا نام ظاہر نہیں کیا۔

اُنہوں نے قومی تعلیم اور غریب طلبا کی اپنی حیثیت سے زیادہ مالی امداد کی دوستوں اور عزیزوں کے لئے ان کی جیب ہمیشہ کشادہ رہی حیدرآباد سے رخصت کے وقت لوگوں کو معلوم ہوا کہ کتنے مساکین ویتامیٰ و ایامے کی کفالت اُن کی ذات سے وابستہ تھی لوگ کہتے ہیں کہ اس وقت تک حیدرآباد میں دو ماتم ہوئے ہیں ایک سالار جنگ اعظم کی موت پر ہوا اور دوسرا محسن الملک کی رخصت پر۔

وظیفہ کے بعد اُن کی آمدنی محدود ہو گئی تھی تاہم اپنی ذات پر تکلیفیں اُٹھا کر غریبوں کی مصیبتیں ہلکی کرتے رہتے تھے اٹاوہ کی غریب سیدانیوں کے لئے وہ قیامت کا دن تھا جب کہ اُن کے سانحہ وفات کی خبر اُنہوں نے سُنی۔

اُن میں عظمت و مرتبت کے ساتھ کچھ بھی ترفع نہ تھا غریب ملنے والوں سے اُن کے برتاؤ میں کوئی رفعت نہ تھی وطن کے غریبوں کے ساتھ بے تکلفی سے ملتے بچپن کے ساتھیوں کے ساتھ وہ ہی خصوصیت نظر آتی۔

۱۸۹۰ء میں جب ایک عظیم الشان جلسہ میں ایڈریس قبول کرکے جواب دے چکے تو ہم وطن غریبوں کے کہنے سے مسجد کے ممبر پر اسی طرح وعظ کہا جیسے کہ اہلمدی پیشکاری کے زمانہ میں کہا کرتے تھے۔

اُن کے فضائل و اخلاق اور اُن کی قومی خدمات کو قبولیت عام حاصل تھی ان کے معاصرین اور وہ اصحاب جنہوں نے مختلف حیثیتوں میں رفیقان کار رہ کر اُن کے ساتھ کام کیا تھا وہ سب اُن کی صفات و اوصاف کے گرویدہ تھے اور اُن میں جو زیادہ قریب تھا اور جس نے زیادہ زمانہ پایا وہ ہی زیادہ معترف و مدّاح تھا۔ یہ مدح و اعتراف ایک ایسی حقیقت تھی کہ اُن کے شدید ترین مخالف اور دشمن بھی اس سے انکار نہ کر سکتے تھے۔

حیدرآبادی زندگی میں نواب سرور جنگ اُن کے انتہائی مخالف تھے وہاں کے بہت سے انقلابات میں اُن کا ہاتھ رہا وہ بھی اپنی کتاب ”مائی لائف“ میں یہ فقرہ

لکھنے پر مجبور ہوئے کہ "وہ مہربان تھے اُن میں خود اعتمادی تھی اُن کی زبان شیریں اور باثر بھی وہ ہر ایک کے ساتھ نیکی کرنے کو آمادہ تھے ..... اُن کے ماتحت اُن کی موت تک اُن کے وفادار رہے" اَلْفَضْلُ مَا شَهِدَتْ بِهِ الْاَعْدَاءُ۔

اُن کی قومی خدمت بے غرض اور بے ریا تھی قوم کے لئے اُن کا دل بے چین تھا اور قومی ترقی کی اُمیدیں اُس دل کا سہارا تھیں۔

اُن کے دل میں قوم کی جو لگن تھی اس کا اثر ہر اس شخص کے قلب پر پڑتا تھا جو چند دن بھی اُن کی صحبت میں بیٹھتا خواہ وہ کوئی غریب ہو یا گمنام ہو یا جلیل القدر ممتاز و معروف ہستی ہو، بڑے بڑے امراو تجار اور عہدہ دار اُن کے اخلاق اور معجز بیانی سے گرویدہ ہوئے اور اُن میں قومی ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو گیا۔

وہ کام کرنے والوں کی خواہ اُن کی کیسی ہی حقیر شخصیت ہو قدر کرتے تھے اور دوسروں سے قدر کراتے تھے، معترضین کے اعتراضوں کو بطوع خاطر سُنتے اور دلائل سے مطمئن کرنے کی کوشش کرتے، اُن پر جن نوجوانوں نے ذاتی حملے کئے اُن کی ذاتی اہانت کی اُن کے ساتھ بھی تلخی کا اظہار نہیں کیا، آفتاب احمد خاں (صاحبزادہ) نے اپنے جوشِ غضب میں رو در رو سخت و سست الفاظ کہے۔ محمد علی (مولانا) نے نہایت تند و تیز تحریریں بھیجیں، شورش طلبا کی تحقیقاتی کمیٹی کے سامنے اعتماد کے خلاف بعض قومی راز ظاہر کئے اسی طرح اور بعض دوسرے برخود غلط نوجوانوں نے دل شکن باتیں کیں لیکن اس مجسمۂ عفو و کرم نے سب کو معاف کر دیا اور اُن کی بھلائی کے لئے ہی کوششیں کیں۔

اُن کا دل محبت کا گنجینہ تھا جو وقفِ عام تھا اعزا کے ساتھ اُن کی مہر و اُلفت ضرب المثل تھی، بھائیوں اور اُن کی اولاد کے شیدا تھے، بڑے بھائی سید غلام عباس کے ساتھ عشق کا درجہ تھا یہ شیعہ سے سُنّی ہو گئے تھے اور وہ راسخ العقیدہ شیعہ تھے

لیکن تبدیل عقائد کا بال برابر اثر نہ تھا بھائی کی خاطر سے آمادہ ہیں کہ بلا کی تعمیر کے لئے جتنے روپیہ کی ضرورت ہوئی اس سے زیادہ دیا۔

سر سید اور اُن کا تو بقول مولانا حالی مرحوم شمع و پروانہ کا معاملہ تھا، آج یہ محبت ایک افسانہ ہے مگر کیسا سبق آموز اور ولولہ انگیز افسانہ۔ شدید اختلافات میں بھی محسن الملک کو گوارا نہ تھا کہ سر سید کے دل کو ذرا بھی ٹھیس لگے اگرچہ یہ نظارہ دیکھنے والے آج دنیا میں نہیں اور نہ ہمیشہ رہ سکتے ہیں لیکن ان دونوں کے وہ خطوط جو شائع ہو چکے ہیں ہر پڑھنے والے کے سامنے یہ نظارہ پیش کرتے ہیں، سید محمود مرحوم کے ساتھ بھی خاص شیفتگی تھی اور اُن کی خوبیوں کا قدر دان و قدر شناس محسن الملک سے زیادہ کوئی اور نہ تھا جب قوم نے کالج کی امانت سید محمود کے ہاتھوں سے لے کر اُن کے سپرد کی تو انہوں نے منظور تو کیا لیکن اُس وقت کا سماں نہایت غم انگیز تھا اس فیصلہ پر آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے آواز بھرا گئی اور صرف یہی کہہ سکے کہ "اس وقت مجھے مرجانا چاہیئے۔ افسوس میں اپنی آنکھوں سے دیکھوں کہ تیس برس کی دوستی کے بعد سید محمود کا عہدہ مجھے ملے"، پھر اجلاس سے باہر جب وہ دونوں ملے تو محسن الملک سید محمود کے قدموں پر گر پڑے اور کہا کہ "اگر تو مجھے سکرٹری مقرر کرے تو میں سکرٹری مقرر ہوتا ہوں"، دونوں نے روتے ہوئے معانقہ کیا اور پیشانی پر بوسے دیئے۔ نواب محسن الملک کے رفیقان کار میں نواب وقار الملک کو خاص امتیاز تھا اُن کے تعلقات پر چالیس سال کا زمانہ ممتد گذرا تھا اور تعلقات بھی کیسے کہ تقریبًا یکساں حالت میں محرری سے اپنی زندگی شروع کرتے ہیں قومی زندگی کا آغاز بھی ساتھ ہی ساتھ ہوتا ہے دونوں ایک ہی مقصد کے لئے ایک ہی مرکز پر مجتمع اور متحد ہو کر سر سید کے بازوے راست و چپ بن جاتے ہیں اور پھر ایک ڈپٹی کلکٹری سے اور دوسرا تحصیلداری سے ساتھ ہی ساتھ حیدرآباد پہونچتے ہیں نظم و نسق ملکی میں اپنی اپنی قابلیتوں کے جوہر نمایاں کرتے ہیں،

یکے بعد دیگرے بالا دست و زیر دست رہتے ہیں پھر ایک ہی سال کے تفاوت سے وظیفہ یاب ہو کر قومی مرکز پر واپس آجاتے ہیں حالات کی ان یکسانی کے ساتھ قدرت نے بہت سے امور میں طبیعت و مزاج مختلف بنائے تھے سرکاری و قومی خدمات میں دونوں کا اصول و طریقہ کار متبائن رہا اور اس تباین سے بسا اوقات عوام ہی نہیں خواص نے بھی دھوکے کھائے کسی نے ان کو باہم رقیب جانا اور ایک کو دوسرے کے زوال کا خواہشمند اور حاسد سمجھا اکثر نے ان کے متصادم ہونے کی کوششیں کیں اور اخبارات کو آلہ کار بنایا۔ قومی کام کرنے والوں میں بھی ہیزم کش بدبختوں کی کمی نہیں ہوتی ہر قسم کی سخن چینی و ہیزم کشی کی گئی مگر اُن کی محبت میں فرق نہ آیا نواب محسن الملک کو اُن کے ساتھ بھائیوں کی سی محبت تھی ان کو اپنا قوت بازو جانتے تھے اور ہر قسم کا اعتماد اُن کی ذات پر تھا اُن کی محبت اور اُن کے تعلقات اب ایک داستان ہیں جو ان کے مکاتیب از بر سنا رہے ہیں۔ وہ جس طرح مالی مدد دینے اور عفو و کرم میں فیاض تھے اسی طرح سفارش کرنے میں بھی فراخ دل تھے اور جب کسی کی سفارش کرتے تو اُس کی کامیابی کی فکر بھی رکھتے معمولی ملازمتوں سے ہائی کورٹ کی ججی[۵] تک ان کی سفارشوں کی مرہون تھیں صدہا خاندان ان کی نظر کرم سے آج بام رفعت پر ہیں، وہ اُن لوگوں کے لئے بھی سفارش سے دریغ نہ کرتے تھے جنہوں نے ان کو تکلیفیں پہونچائی ہوتیں، وہ ہمیشہ مخالفتوں کو موافقتوں سے بدلنے کی کوشش کرتے اور اکثر کامیاب ہوتے بمبئی میں بعض خاندان علی گڑھ تحریک کے رقیب تھے اور ہمیشہ اس کا استخفاف کرتے رہتے تھے

---

۵ یہ واقعہ ہے کہ پٹنہ کے مولوی شرف الدین (جو کلکتہ ہائی کورٹ میں مقرر ہوئے) اور لاہور کے جسٹس شاہدین دونوں کے لئے نواب محسن الملک نے سفارش و کوشش کی تھی جس کے متعلق مستند تحریریں مؤلف کے پیش نظر ہیں۔

صرف ناخدا محمد علی روغنے کا ایک خاندان تھا جو نواب صاحب کے ذاتی تعلقات کی وجہ سے اس تحریک کا ہمدرد تھا، یہ نواب صاحب کی ہی کوشش و اخلاق کا اثر تھا کہ رقیب خاندانوں میں اس تحریک سے ہمدردی و تعلق پیدا کرا دیا اور سب کی توجہ قومی مرکز کی طرف مائل کر دی جس کے نتیجہ میں تجار و امرا اور عام اصحاب کا رجحان علیگڑھ کی قومی تحریک کی جانب ہو گیا کالج کی قومی عظمت میں زبردست اضافہ ہوا مختلف انجمنوں اور مجلسوں میں ان کی ولولہ انگیز تقریروں نے اور اخبارات میں پُرجوش مضامین نے عوام و خواص کے ساتھ بے تکلفانہ اور دلکش ملاقاتوں نے لوگوں کو مسخر کر لیا، مسٹر جسٹس بدرالدین طیب جی کو علیگڑھ تحریک سے کوئی دلچسپی نہ تھی وہ کانگریسی تھے اور ایک حد تک مخالف سمجھے جاتے تھے انہوں نے دو مرتبہ ٹرسٹی شپ سے اور ایک مرتبہ کانفرنس کی صدارت سے انکار کر دیا تھا لیکن اُنہوں نے ہی یونیورسٹی تحریک کی تائید کی کانفرنس کو دعوت دی اور صدارت کی۔

نواب محسن الملک اگرچہ بعض اوقات جذبات سے مغلوب نظر آتے تھے لیکن اُن کا کوئی اقدام و عمل اضطراری و اضطرابی نہ ہوتا تھا اُن کے خطوط جو نواب وقار الملک کے نام ہیں اُن میں چند انتہائی جذبات سے معمور ہیں مگر مہمات امور میں اُن کا استقلال ضرب المثل ہے سر سید کی رحلت کے بعد جو واقعات و حالات در پیش تھے اُن کو بھی اُن کے استقلال ہی نے رو براہ کیا۔

نواب عماد الملک نے اُن کی زندگی پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ "یہ اُن کی قابلیت اور اُن کا استقلال تھا جس سے حیدرآباد کی ابتدائی مشکلات دور ہو گئیں اور اُن کے ساتھ

---

[۱] نواب عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی ۱۸۷۳ء سے ۱۹۱۵ء تک حیدرآباد میں مناصب جلیلہ پر مامور رہے اول سر سالار جنگ اول کے پرائیویٹ سکریٹری مقرر ہوئے تھے اور پھر دوسرے عہدوں پر ترقی پائی مغربی و مشرقی علوم کے ماہر تھے ویسرائے ہند اور وزیر ہند کی کونسل میں بھی ممبر رہے علی گڑھ تحریک کے زبردست حامی تھے اور فیاضانہ امدادیں دیتے تھے رحلت ۱۹۲۶ء۔

کام کرنے والوں کو اُن پر پورا اعتماد ہوگیا وہ نہایت اہم انتظامی اصلاحیں جاری کرنے میں کامیاب ہوئے آج کل جو طریقہ بندوبست مروج ہے وہ انہیں کی تدبیروں کا نتیجہ ہے سر سالار جنگ کی نگاہ میں وہ ایک قابل اعتماد شخص تھے اور اس معاملہ میں اُن کی دُور بین نظر پوری اُتری۔ سرکار نظام کی ملازمت سے علیحدہ ہونے کے بعد اُنہوں نے اپنی تمام قوتیں علی گڑھ کالج کے لئے وقف کر دیں .... اُن میں ایک صفت نہایت اعلیٰ تھی جو عام طور پر نہایت کم پائی جاتی ہے یعنی حکمت عملی یا بہ لحاظ موقع اور وقت کے خاص طرز عمل اختیار کرنے کا ملکہ۔ وہ مخالف طبیعتوں میں یک جہتی پیدا کر دیتے تھے اور اُس موقع پر دوستانہ اتحاد[1] پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتے تھے جہاں ایسے اتحاد کی بالکل توقع نہ ہوتی تھی" سر تھیوڈر ماریسن نے اپنے تاثرات کو یوں ظاہر کیا تھا کہ "وہ اس قدر رحم دل اور نیک نفس انسان تھے کہ میں نے کسی کو اس صفت میں ان سے زیادہ نہیں دیکھا ہے یہی نیک نفسی اور رحم دلی اُن کی کامیابی کا اصلی راز تھی وہ وفاداری اور محبت سے لوگوں کے دلوں کو معمور کر دینے میں کمال رکھتے تھے اور اسی لئے مختلف طبیعت اور عادت کے لوگوں کو اپنا معاون اور شریک حال بنا لینے میں وہ کامیاب ہوتے تھے، اُن کی کامیابیو پر ہم جو کچھ اُن کی تعریف کریں وہ کم ہے لیکن حقیقت میں وہ اُس لئے اور بھی قابل ستائش ہیں کہ بہت سی مضر باتیں اُنہوں نے ہونے نہ دیں عام طور پر لوگوں کو معلوم نہیں ہے کہ اُنہوں نے کس قدر ناعاقبت اندیشیوں کا ایسے زمانہ میں انسداد کیا ہے جب کہ اعتدال پسند نصیحتیں ناگوار معلوم ہوتی تھیں اور ناصح کو ہر وقت اپنی بدنامی کا خطرہ درپیش رہتا تھا"

حیدرآباد کی پریشان و شوکت زندگی میں صرف یہی نہیں کہ دربار نظام اور امرائے

---

[1] صاحبزادہ آفتاب احمد خاں اور مولانا شوکت علی خاں میں اسی اتحاد پیدا کرنے کے لئے اُنہوں نے بہت سی روحانی تکالیف انگیز کیں لیکن موت نے جلدی کی ورنہ ان پارٹیوں کی یہ مخالفت جس سے قوم کو بہت سے نقصان پہونچے اور اس کا شیرازہ بکھرا باقی نہ رہتی۔

دکن سے امداد دیں دلوائیں اور اپنی ذات سے کیں بلکہ اپنے مرتبہ کے اثر کو جہاں موقع ہوا قوم کے لئے استعمال کیا مسٹر گلیڈاسٹون کی ملاقات کا تذکرہ ناظرین دیکھ چکے ہیں اس موقع پر لارڈ ڈفرن[1] سابق ویسرائے ہند کا ایک خط درج کیا جاتا ہے جس سے معلوم ہوگا کہ ذاتی تعلقات میں قوم کا کس درجہ خیال تھا۔

لارڈ ڈفرن کا خط

سفارت خانہ برطانیہ روم
۱۰ فروری ۱۸۸۹ء

مائی ڈیر محسن الملک

آپ کا خط مورخہ ۴ جنوری پاکر مجھے جو مسرت حاصل ہوئی ہے اُس کے اظہار کی ضرورت نہیں سمجھتا آپ یقین کیجئے کہ میں نہ صرف اُن تمام معاملات میں انتہائی دلچسپی لیتا رہوں گا جن کا تعلق ہز ہائینس نظام حیدرآباد اور اُن کی ریاست سے ہے بلکہ ملک معظم کی ہندستانی مسلم رعایا کی فلاح و بہبود کو بھی ہمیشہ پیش نظر رکھوں گا۔میں ہندوستان کے دوران قیام میں پورے طور سے ان وجوہ پر غور کرچکا ہوں جو ہندوؤں سے مقابلہ کرنے میں مسلمانوں کے واسطے سدِّراہ ہیں اور مجھے ہر طور پر یقین ہے کہ حکومت ہند کی بہبود کے لئے یہ امر بہت ضروری ہے کہ اُن کی ہر قسم کی ہمت افزائی غیر جانب دارانہ اصول کے ماتحت جس پر ہماری حکومت کی بنیاد ہے کرنی چاہئے تاکہ یہ اُن دشواریوں کا مقابلہ کرسکیں جو اُنہیں پیش آرہی ہیں یہ امر واقعہ ہے کہ سارے نظام سلطنت پر اس کا ایسی صورت میں اثر پڑتا ہے جب کہ ایک اہم۔ ذہین اور ممتاز جماعت کو اپنے استحقاق کے مطابق قوم کی عام فلاح میں حصہ لینے سے باز رکھا جائے لیکن افسوس یہ ہے کہ حکومت اس بارہ میں کچھ نہیں کرسکتی حقیقی حل مسلمانان ہند کی اس وقت کا اُن کے خود ہاتھ میں ہے جس زمانہ میں

---

[1] ویسرائلٹی کے بعد سفارت روم پر مامور ہوئے تھے۔

ایک کمسن ہندو لڑکا حساب اور انگریزی کی تعلیم میں مصروف رہتا ہے غریب مسلمان لڑکا قرآن کی غیر محدود سورتیں حفظ کرتا رہتا ہے جس کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے کو اُس سے بہت پیچھے پاتا ہے میں یہ نہیں سمجھتا کہ دنیا کا کوئی اور مذہب ہوگا جس میں اپنی مذہبی کتابوں کا برزبان جاننا ناقابل فرد گزاشت ضروریات میں داخل ہو۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ ان سخت مذہبی مطالبات میں کچھ کمی کی جائے کیونکہ اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ چونکہ ایک لڑکے نے کتاب کے اوراق حفظ کئے ہیں تو وہ اُن کے مطالب اور معانی سمجھنے پر بھی قدرت رکھتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ تعلیم ہی ایک ایسا آلہ ہے جس کے ذریعہ سے دور حاضر میں دنیا کے دروازے سب کے واسطے کھُلے ہوئے ہیں۔

آپ کا مخلص

(دستخط) ڈفرن اینڈ آوا

نواب محسن الملک کو زمانہ ملازمت میں اپنے ماتحتوں کے ساتھ جو شفقت و رافت تھی وہ ضرب المثل بن گئی تھی لیکن کالج اور قوم کی خدمت میں اُنھوں نے افسری و ماتحتی کے امتیاز کو اُٹھا دیا تھا، تقریر و تحریر اور برتاؤ میں ایسی حوصلہ افزائی اور تحسین کرتے تھے کہ کام کرنے والوں کے دلوں میں جذبہ پیدا ہوتا تھا۔ مولوی انوار احمد صاحب سفیر کانفرنس کو لکھتے ہیں۔

نواب محسن الملک کا ایک خط

عزیزی انوار احمد۔ تار اور خطوط ملے۔ کالج اور کانفرنس اور ہمارے جملہ کاموں کے متعلق جو عمدہ اور مفید خیالات اہل رنگون کے دلوں میں تم نے پیدا کئے دل سے تمہارے لئے دعا نکلتی ہے۔

مسٹر سلیمان اور مسٹر جمال کے خطوط اور تار بھی میرے بلانے کے آئے مگر تم دیکھو تو کہ یہ دن میرے گھر سے نکلنے کے ہیں آئے دن بیمار رہتا ہوں بیگم صاحبہ کی طبیعت جدا خراب ہے

لے مولوی انوار احمد صاحب زبیری مارہروی سفیر کانفرنس۔

اٹاوہ میں بڑے بھائی بیمار ہیں یہاں علی گڑھ میں طاعون پھیلا ہوا ہے اس حالت میں رنگون کا سفر کیا تم نے میرے لئے آسان سمجھ لیا ہے اور کیا تم یہ یقین کئے بیٹھے ہو کہ میں تمہارے دو چار خطوں اور تاروں کے بھروسے پر چل کھڑا ہوں گا۔ ادھر لکھنؤ میں کانفرنس کرنے کا ارادہ ہے نان پارہ سے بڑی کوشش کے بعد تیس ہزار کا وعدہ ہوا ہے راجہ جہانگیر آباد اور راجہ محمود آباد کو مائل کرنے کی علیحدہ تدبیریں ہو رہی ہیں اور ادھر سے دوسری بہت سی اُمیدیں ہیں۔

اُن سب اُمیدوں سے قطع نظر کر کے اگر میں رنگون گیا اور وہاں سے جیتا لوٹا تب جانوں گا کہ دوبارہ زندگی پائی۔ بہرحال ادھر کی تمام اُمیدوں کو ترک کر کے صرف تمہارے بلانے اور اصرار کرنے سے محض اِس لئے کہ تم نے اتنے دور دراز مقام پر پہنچ کر کالج کی بہبودی کے لئے کوشش کی ہے رنگون آتا ہوں۔ میرے ساتھ ایک ڈاکٹر اور مولوی شاہ سلیمان پھلواری والے اور مولوی بشیر الدین بھی ہوں گے، خدمت گار علیحدہ روانگی کی اطلاع تار کے ذریعہ سے دوبارہ دوں گا، اب دیکھتا ہوں وہاں سے کیا ملے گا اگر تیس ہزار بھی نہ ملے تو ہم بڑے گھاٹے میں رہیں گے تمہارا شکر ادا کرنے کو جی نہیں چاہتا لیکن جو کچھ وہاں سے ملے گا میں یہ سمجھوں گا کہ تم نے دیا اور دلایا۔"

نواب صاحب رنگون گئے، مہینہ بھر قیام ہوا اور گھاٹے میں نہیں بلکہ بڑے فائدہ میں رہے پچاس ہزار روپیہ کالج کو ملا اور ایک دائمی مستقل اثر قائم ہو گیا۔

اُن کی کامیابیوں کا راز اُن کے برتاؤ اور اُن کی فصاحت و بلاغت میں مضمر تھا مسٹر جی۔ ایچ۔ ٹول[1] کہتے ہیں کہ:۔

"اسٹاف کے درمیان ٹرسٹیوں کے افسر عامل ہونے کی حیثیت کے علاوہ بھی

---

[1] ۱۹۰۲ء میں پروفیسر مقرر ہوئے مسٹر آرچبولڈ کے بعد ۱۹۱۱ء میں پرنسپل مقرر کئے گئے ۱۹۱۸ء میں مستعفی ہو کر پنجاب کے ڈائرکٹر تعلیمات ہوئے۔

نواب مرحوم سب کے ساتھ گہری دوستی رکھتے تھے وہ ایک اعلیٰ درجہ کے نشین تھے اور اُن کی وہ خداداد فصاحت و بلاغت جس نے ان کو ایسا شہرۂ آفاق "اڈیٹر" بنادیا تھا اس کے سبب سے وہ سوشیل جلسوں میں بھی ایک نہایت خوش خلق اور متواضع دوست تھے کوئی شخص جس کو اُن کی باتیں سننے کا موقع حاصل رہا ہے اس بے مثل اور ناقابل نقل طریقہ کو جس سے وہ کوئی پُر لطف حکایت بیان کرتے تھے یا اُس خلوص کو جس سے وہ ہر ایک کا استقبال کرتے تھے اور اُن کے عنایت آمیز تبسم کو نہیں بھول سکتا، ہم لوگوں نے جو یہاں ہیں نیز علی گڑھ کی چار دیواری کے باہر ہزارہا مسلمانوں نے نواب صاحب کی تقریریں سُنی ہیں، ان کی تقریریں ایک بڑے کامل فصیح و بلیغ اسپیکر کی تقریر کا لطف تھا اور اس میں کچھ مبالغہ نہیں کہ وہ اپنے سامعین کو ایک لمحہ میں ہنسا سکتے تھے اور دوسرے لمحے میں رلا سکتے تھے"

شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ خاں[۱] مرحوم نے اُن کی خطابت اور طرز تحریر کے متعلق لکھا ہے کہ:۔

"نواب محسن الملک شکل و شمائل کے لحاظ سے نہایت وجیہ اور مقدس دکھائی دیتے تھے اور جب کسی بھرے جلسہ میں وہ اسپیچ دینے کھڑے ہوتے تھے تو خود بخود سب کی نظریں محبت اور عزت کی فیلنگ کے ساتھ اُن کی طرف اُٹھ جاتی تھیں۔ اسپیچ دینے کی فطرتی قابلیت اُن میں موجود تھی۔ اُن کی اسپیچوں سے تمام حاضرین متاثر ہوتے تھے اور اُن کو رُلانا اور ہنسانا بالکل اُن کے

---

[۱] دہلی کے رہنے والے اور مرحوم دہلی کالج کے نامور طالب علم اور سینٹرل میور کالج الٰہ آباد میں پروفیسر تھے اُن کی علمی قابلیت و شہرت اپنے معاصرین میں ممتاز ہے اُن کے مضامین ہر لحاظ سے نہایت وسیع ہوتے تھے اُن کی متر جمہ، مؤلفہ اور مصنفہ چھوٹی بڑی کتابوں کی تعداد تقریباً پچاس۔ ساٹھ ہے۔ علی گڑھ تحریک کے بڑے معاون اور سرسید کے بڑے دوست تھے۔ رحلت ۱۹۱۰ء

اختیار میں تھا۔ کانفرنس کی رودادوں میں اُن کی جو اسپیچیں درج ہیں وہ فصاحت وبلاغت کا ایک بیش بہا خزانہ ہیں۔

تقریر کی طرح تحریر میں بھی اُن کو خاص ملکہ تھا۔ اُن کا طرز تحریر ہندوستان کے تمام مشہور مصنفوں کے طرز تحریر سے بالکل الگ ہے اور اس میں ایک خاص لطافت اور دل فریبی پائی جاتی ہے۔ اُن کی تصنیفات سے "آیات بینات" اور رسالہ "تقلید وعمل بالحدیث" اور چند چھوٹے چھوٹے رسالے یادگار ہیں تہذیب الاخلاق اور انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور معارف میں بھی اُن کے بعض مضامین قابل دید ہیں۔

ظرافت اور زندہ دلی اُن میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ جو لوگ اُن سے ملتے تھے وہ اسی وجہ سے اُن کے پاس بیٹھنے سے گھنٹوں نہیں اکتاتے تھے اُن کے خاص خطوط جو اُنھوں نے اپنے دوستوں کو لکھے ہیں اسی قابل ہیں کہ ایک جگہ جمع کیے جائیں اور کتاب کی شکل میں شائع کیے جائیں۔ اُن خطوط سے اُن کی بعض عادات وخصائل پر پر روشنی پڑتی ہے اور اُن کے دل رُبا طرز تحریر کے بہت سے عمدہ حصے اُن خطوط میں موجود ہیں جو اس قابل ہیں کہ اُن کو ضائع نہ ہونے دیا جائے۔[1]

بعض اعتراضات بعض اصحاب اُن کی کمزوری طبیعت پر اعتراض کرتے رہتے تھے جیسا کہ کمیشن کی رپورٹ میں بھی ایک ممبر نے لکھا تھا، کوئی شک نہیں کہ بعض معاملات میں وہ کمزور نظر آتے تھے مگر عموماً وہ کمزوری اُن کی انتہائی صفتِ تحمل کی بنا پر ہوتی تھی جس کا اشارہ نواب وقار الملک نے اپنے مضمون میں کیا ہے بعض اوقات وہ خیر کثیر کے لئے شر قلیل گوارا کر لیتے تھے، مگر جہاں اصول کا سوال آتا تھا وہاں بڑی سی بڑی شخصیت سے مرعوب نہ ہوتے تھے اُردو، ہندی کے قضیہ میں سر انٹونی میکڈانل کے خوف سے نہیں بلکہ اپنے اعوان وانصار کی کمزوری محسوس کر کے اُنھوں نے

---

[1] بڑی کوشش کے بعد جس قدر خطوط دستیاب ہوئے اُن کو مؤلف نے ۱۹۱۸ء میں شائع کر دیا ہے۔

وہ طرزِ عمل اختیار کیا جو اُس وقت سب سے زیادہ مناسب تھا ورنہ کالج کو شدید خطرات کا مقابلہ کرنا پڑتا قوم میں اتنی جرأت نہ تھی کہ حکمرانِ صوبہ کے مقابلہ کی تاب لاسکتی اور کالج جس کی مالی بنیاد متزلزل ہو رہی تھی اپنی موجودہ حیثیت بھی قائم نہ رکھ سکتا یا یہ کہ وہ اُن کی خداداد قابلیتوں کے بیش بہا فوائد سے محروم ہو جاتا لیکن اس اصول کو کہ قومی معاملات میں کالج کا سکرٹری اپنی آزادی رائے قائم رکھ سکتا ہے اُنہوں نے سر انٹونی کے جانشین سے منوا لیا اور اس طرح آیندہ کے لئے راستہ صاف کر دیا۔ عربی تعلیم کی اسکیم کے متعلق اُنہوں نے برملا مخالفت کی سر تھیوڈر ماریسن، ہز ہائینس سر آغا خاں اور سر جیمس لاٹوش کی راؤں کے برخلاف اپنی رائے ظاہر کی اور اس پر اصرار کیا۔

سر سید میموریل فنڈ میں سب سے پہلے اور سب سے گراں قدر امداد ہز ہائینس نواب حامد علی خاں جنت آرام گاہ نے عطا کی جو اُس وقت کے حالات کے لحاظ سے نہایت اہمیت و قیمت رکھتی تھی۔ لیکن ساتھ ہی ایسی شرائط پیش ہوئیں جو اصول پر مؤثر تھیں تو نواب صاحب نے اُن شرائط کے قبول کرنے سے صاف انکار کیا۔

بعض رفقا نے یہ اعتراض بھی کیا کہ نواب محسن الملک نے مسلمانوں کی تعلیمی باگ اپنے ہاتھ میں رکھنے کی جگہ حکومت کو تفویض کر دی لیکن ان معترضین نے اس بات کو ذہن سے نکال دیا کہ حکومت کسی کے تفویض اختیارات کی احتیاج نہیں رکھتی اور یہاں تو بہت پہلے ہی سے خود ٹرسٹی اپنے قانون کے ذریعہ ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن اور لفٹننٹ گورنر کو وزیٹر اور پیٹرن کی حیثیت سے غیر معمولی اختیارات تفویض کر چکے تھے اور اُن ہی میں ایک متعدد جماعت ان اختیارات کے برقرار رکھنے کی زبردست حامی تھی تاہم اُن قدرتی اور مفوضہ اختیارات سے کالج کو کوئی نقصان نہیں پہونچا بلکہ اُن کا استعمال ہمیشہ کالج کی ترقی اور بہبودی میں ہی ہوا۔

سر انٹونی میکڈانل بھی باوجود ذاتی مخالفت کے کوئی نقصان نہ پہنچا سکے بلکہ عین ضرورت

ے وقت ان کی گورنمنٹ سے فائدہ ہی پہونچا۔

بڑا اعتراض یوروپین اسٹاف کے اقتدار پر کیا جاتا ہے مگر یہ اقتدار پہلے سے قائم تھا اور اگر اُس وقت اُس کے کم کرنے یا زائل کرنے کی کوشش کی جاتی تو یقیناً وہ شرارہ بلند ہوتا کہ مستقبل کی تمام توقعات راکھ کا ڈھیر بن جاتیں اور کچھ عجب نہ تھا کہ ایم، اے، او، کالج ایک سرکاری ادارہ ہو جاتا، پھر بعض ایسے عناصر بھی تھے جو صاف طور پر اسی اقتدار کی حمایت میں تھے، بروئے قانون اندرونی انتظام میں پرنسپل کو اختیارات کلی حاصل تھے با ایں ہمہ اسی اقتدار سے خوشگوار نتائج حاصل کر لینا محسن الملک کا کمال ذہانت و تدبر تھا۔

سر تھیوڈر ماریسن کے بعد اس اقتدار میں یقیناً کمی آجاتی مسٹر آرچبولڈ کے آنے کے چار ماہ بعد ہی نواب محسن الملک نے اپنی تقریر میں تمام امور واضح کر دیے تھے مگر ایک طرف شملہ ڈپوٹیشن کی مصروفیتیں تھیں جن پر قوم کے سیاسی مستقبل کا انحصار تھا دوسری طرف امیر افغانستان کی وزٹ کا اہتمام تھا جس سے کالج کا ایک نیا دَور شروع ہونے والا تھا اُن اسباب سے اندرونی اصلاحات کا کوئی موقع نہ ملا تھا کہ پُرجوش نوجوانوں کا تصادم شروع ہو گیا اور کالج میں اندرونی بے چینی پھیل گئی جس کے نتیجہ میں وہ شورش ہوئی جو نواب محسن الملک کا سبب موت بن گئی، ۱۹ سال کے ایسے زبردست نظام کو بدلنا چند مہینوں کا کام نہ تھا، بس یہی کمزوریاں تھیں جن پر بعض اطراف سے نکتہ چینی ہوتی تھی۔

جیتا تھا تو لوگوں کو گمان اُس پہ تھے کیا کیا[1]	پر مَر کے خلوص اپنا وہ منوا گیا آخر
جو خندہ زنی کرتے تھے ہر کام پہ اُس کے	وہ خون کے آنسو انھیں رُلوا گیا آخر
یوں جیتے ہیں یوں مرتے ہیں قوموں کے فدائی	دُنیا کو تماشہ یہ وہ دکھلا گیا آخر
مہدی کے لئے قوم عزادار ہے ساری	کہرام ہے کشمیر سے تاراس کماری

---

[1] مولانا حالی۔ رحلت ۱۹۱۴ء

خصوصیات و فضائل پر معاصرین کا تبصرہ

"اس باب آخر میں اُن چند اصحاب محترم کے مضامین و تقاریر سے اقتباسات بطور تبصرہ خصوصیات و فضائل پیش کئے جاتے ہیں جن کو نواب محسن الملک کے ساتھ سالہائے دراز تک ذاتی تعلق رہا اور رفیق کار کی حیثیت سے کام کرنے کا موقع ملا اور وہ ہی ان جوہروں کے زبردست نقاد و مبصر تھے جن کے مجموعہ کا نام سید مہدی علی یا محسن الملک تھا"

مولوی وحید الدین سلیم[1]

(۱) نواب محسن الملک کی آغاز شباب سے یہ عادت تھی کہ جو کام ملازمت کا اُن کے سپرد کیا جاتا تھا وہ اُس کو خوب جی لگا کر انجام دیتے تھے اور اُس کے انجام دینے میں نہایت محنت اور جفاکشی کرتے تھے۔ جی لگا کر کام کرنے اور محنت و کوشش کا پورا حق ادا کرنے کے سبب سے ہر ایک کام جس کو وہ ہاتھ میں لیتے تھے ادنیٰ حالت سے اعلیٰ حالت میں ترقی کر جاتا تھا اسی سبب سے ان کے افسر بھی ان سے خوش رہتے تھے اور اُن کی ترقی تنخواہ و عہدہ کے لئے ہر وقت کمر بستہ رہا کرتے تھے۔

(۲) ایک عادت نواب محسن الملک میں یہ تھی کہ وہ مختلف عقائد کے لوگوں سے نہایت دوستانہ برتاؤ کرتے تھے اُن کے دوستوں کا حلقہ سر سید مرحوم کی نسبت زیادہ وسیع تھا۔ عیسائی، پارسی، یہودی، ہندو اور مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے لوگ اُن سے ملاقات کرتے تھے اور کسی کو اُن سے شکایت نہیں ہوتی تھی بلکہ سب اُن کے حسنِ اخلاق کے مدّاح اور ثناخواں پائے جاتے تھے۔ ملاقات کے وقت کبھی

---

[1] مولوی وحید الدین صاحب سلیم نے عرصہ تک نواب صاحب کی ماتحتی میں انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے فرائض ادا انجام دیئے جامع عثمانیہ کے دار الترجمہ کے رکن تھے اور عثمانیہ یونیورسٹی میں اُردو پروفیسر تھے۔ رحلت ۱۹۲۹ء

کوئی ایسی بات اُن کی زبان پر بھولے سے بھی نہیں آتی تھی جو کسی گروہ کے آدمی کے لیے
رنج دہ اور باعث شکایت ہو۔

(۳) نہایت اعلیٰ اور پاکیزہ خصلت نواب صاحب میں پائی جاتی تھی وہ یہ تھی کہ اُن کو کسی معاملہ میں کسی شخص کے اختلاف رائے سے رنج نہیں ہوتا تھا۔ وہ نہایت خندہ پیشانی سے ہر شخص کے اختلاف رائے کو سنتے اور اُس پر غور کرتے تھے یہ اختلاف رائے کسی شخص کی طرف سے خواہ تحریری ہوتا، یا کوئی شخص اُن کے روبرو زبانی طور پر اختلاف رائے کا اظہار کرتا یہ ممکن نہ تھا کہ اُس کے پڑھنے یا سننے کے بعد اُن کے تیور پر کوئی شکن آئے۔

بعض موقعوں پر ہم نے یہاں تک دیکھا ہے کہ لوگوں نے اُن کے سامنے نہایت دریدہ دہنی کے ساتھ ان کی ذات پر حملے کئے اور اختلاف رائے ہی پر بس نہیں کی بلکہ کھُلم کھُلا مخالفت کا اظہار کیا تاہم وہ اس مخالفت کو ہنسی اور خوشی کے ساتھ انگیز کرتے رہے اور کوئی ایسی حرکت اُن سے ظہور میں نہیں آئی جو اُن کی شان کے خلاف ہو حاضرین پر اس تحمل کا بہت نمایاں اثر ہوتا تھا اور اکثر حیرت میں غرق ہو جاتے تھے۔

(۴) ایک عادت ہمیشہ سے نواب محسن الملک مرحوم میں یہ تھی کہ وہ ہر ایک نئی بات کو قبول کرنے میں اوّل اوّل ہچکچاتے تھے مگر جب یہ ثابت ہو جاتا تھا کہ وہ بات معقول ہے گو کہ اُن کے پرانے خیالات کے خلاف ہے تو وہ بخوشی اُس کو قبول کر لیتے تھے اور جب تک کہ اُس کے خلاف کوئی بات ثابت نہیں ہوتی تھی اس کو برابر مانتے رہتے تھے اور زبان اور قلم سے اُس کی ہمیشہ حمایت کرتے تھے اسی عادت نے اُن کے خیالات کو ترقی دی تھی اور اُن کے دل و دماغ کو منور کیا تھا۔ سر سید مرحوم کی طبیعت میں جدّت تھی وہ جب غور و فکر کرنے کے بعد کوئی ایسی بات اپنے قلم سے لکھتے جو عام لوگوں کے مسلمات کے برخلاف ہوتی تھی تو نواب محسن الملک شدّ و مد کے ساتھ اس سے اختلاف کرتے تھے اور قلم اور زبان سے اُس کے رد کرنے میں کام لیتے تھے مگر جب اُن پر اچھی طرح ثابت ہو جاتا کہ سر سید

کی رائے نہایت مضبوط اور مدلل ہے تو وہ اُس کی مخالفت چھوڑ دیتے تھے اور اُس کی حمایت اور تائید میں زبان اور قلم کا زور صرف کرنے لگتے تھے۔

(۵) مرتے دم تک نواب محسن الملک کو مطالعہ کا شوق رہا انگریزی اُردو اور عربی کے بہت سے رسالے اور اخبار اُن کے پاس آیا کرتے تھے اور ڈاک کے آنے پر وہ نہایت سرگرمی کے ساتھ اُن کے دیکھنے میں محو ہو جاتے تھے۔ عربی، فارسی، اُردو، انگریزی کی کتابوں کا ایک کتب خانہ اُن کے ساتھ رہتا تھا۔ رات کو پلنگ پر لیٹ کر جس کتاب کو وہ چاہتے مطالعہ کرنے لگتے تھے اور قابلِ یادداشت مقامات کا نشان اُس کتاب کے حاشیہ پر کرتے جاتے تھے۔ جب ساری کتاب دیکھ چکتے تو کتاب کے اوّل میں تمام قابلِ یادداشت مقامات کے عنوان اپنے قلم سے لکھکر اُن کے سامنے صفحات کے نمبر لکھ دیا کرتے تھے اس عادت نے اُن کی معلومات کے دائرہ کو بہت وسیع کر دیا تھا اور باقاعدہ یادداشت لکھنے کے سبب سے وہ جس بات کو چاہتے۔ بے تکلف اپنی تحریر یا تقریر میں لے آتے تھے۔

(۶) جن لوگوں سے اُن کی جان پہچان اور ملاقات ہوتی تھی اُن کے ساتھ وہ ہمیشہ فیاضانہ سلوک کرتے تھے نہ حکام کو اُن کی نسبت سفارش لکھنے میں دریغ کرتے تھے اور نہ بذاتِ خود اُن کی مدد کرنے میں کوتاہی کرتے تھے۔ حیدرآباد میں سیکڑوں آدمیوں کو، جو مختلف قوم اور مذہب کے تھے۔ اُنھوں نے نوکر رکھوایا اور سیکڑوں کے ساتھ اپنی ذات سے سلوک کیا۔ یہ ہی سبب تھا کہ جب وہ حیدرآباد سے چلنے لگے تو ریلوے اسٹیشن پر کثرت سے آدمی آئے تھے جو اُن کی جدائی کے رنج میں زار زار روتے تھے۔ حالاں کہ یہ نظارہ حیدرآباد سے قطع تعلق کرنے والوں کی رخصت کے وقت کبھی نہیں دیکھا گیا۔ فیاضی اور سخاوت اُن کی گھُٹی میں تھی اور یہ ہی وہ عمدہ عادت تھی جس کے سبب سے بے شمار آدمی اُن کے دامِ اخلاق میں ہمیشہ کے لئے اسیر ہو گئے تھے۔

(۷) اپنے ماتحتوں اور نوکروں کے ساتھ نواب محسن الملک مرحوم کا برتاؤ وہ ہی تھا

جو ماموں رشید کا برتاؤ تھا۔ اُن کے عفو و تحمل کی عادت نے اُن کے نوکروں کو کسی قدر شوخ کر دیا تھا اور اکثر اوقات وہ اُن کی شان کے خلاف گستاخی کر بیٹھتے تھے مگر ممکن نہ تھا کہ وہ کسی نوکر کو اس کی گستاخی کی سزا دیں یا ہمیشہ کے لئے اُس سے ناراض ہوجائیں۔ نوکر اُن کی عادت کو سمجھتے تھے اور اس لئے جب کبھی وہ کسی نوکر پر خفا ہوتے، تو وہ اپنے تئیں نہایت افسردہ اور ناراض بنا لیتا تھا۔ اس حالت میں نواب صاحب مرحوم خود اُس نوکر سے اپنے برتاؤ کی معافی مانگتے تھے اور بار بار مانگتے تھے جب تک کہ وہ یہ نہ کہدے کہ اب میں آپ سے راضی ہوں۔

(۸) قومی کاموں میں وہ اپنا روپیہ بے دریغ صرف کرتے تھے اور اُن کو اس امر کا خیال نہیں ہوتا تھا کہ اس ایثار کا اُن کے ذاتی اخراجات پر کیا اثر ہوگا۔ سرسید مرحوم نے جب سے مدرستہ العلوم قائم کیا تھا وہ ہمیشہ بے مانگے اور اُن کے مانگنے پر اپنے روپیہ سے مدرسہ کی امداد کرتے رہے۔ سرسید مرحوم اپنے سچے دوست نواب محسن الملک کے مال کو اپنا مال سمجھتے تھے اور اپنے مال کو قوم کے لئے وقف خیال کرتے تھے وہ جب چاہتے اُن کی جیب میں ہاتھ ڈال دیتے تھے اور جو چاہتے اس میں سے نکال لیتے تھے۔ نواب محسن الملک نے اس میں نہ کبھی عذر کیا نہ کبھی تنگ دلی کا اظہار کیا۔ سرسید مرحوم کی قومی فیاضی اُن کی شخصی فیاضی پر سبقت لے گئی تھی، مگر نواب محسن الملک میں دونوں قسم کی فیاضی آخر دم تک موجود تھی۔

(۹) نواب محسن الملک اپنے دشمنوں اور مخالفوں سے بھی انتقام نہ لیتے تھے۔ نہ اس خیال کو اپنے دل میں آنے دیتے تھے وہ نہایت پاکیزہ خصلت اور شریف طبیعت بزرگ تھے کبھی اُن کے کسی مخالف یا دشمن کو یہ خیال نہیں آتا تھا کہ وہ اُس سے انتقام لینے کے درپے ہیں۔ سرسید مرحوم میں اور نواب صاحب مرحوم میں یہ خصلت یکساں درجے کی تھی دونوں بزرگوں کے دل عداوت، حسد، کینہ اور انتقام کے خیالات سے پاک و صاف

رہتے تھے ۔

(۱۰) نہ ایام ملازمت میں اور نہ بعد ایام ملازمت کے کبھی اُن کے دل میں حُبِّ جاہ کا خیال آیا وہ جو کام کرتے تھے اس غرض سے نہیں کرتے تھے کہ گورنمنٹ اُن کو کوئی اعزاز عطا کرے گی یا قوم اُن کے احسانات کا اعتراف کرے گی۔ اُن کے تمام سرکاری اور قومی کام جن کو وہ نہایت محنت اور سرگرمی سے کرتے تھے حُبِّ جاہ اور غرض مندی کے شائبہ سے پاک اور مبّرا ہوتے تھے ۔

(۱۱) جس قدر قومی کام بڑے بڑے اُن کے ہاتھوں سے سرانجام ہوئے اگر اُن میں سے ایک کام بھی کسی اور کے ہاتھ سے انجام پاتا۔ تو اُس کے لئے نہایت فخر اور تعلّی کا موقع تھا مگر نواب محسن الملک نے کبھی اپنی ستائش یا تعلّی کا اظہار خلوت یا جلوت اور تحریر یا تقریر میں نہیں کیا۔ وہ اپنے تئیں قومی کاموں میں ہمیشہ گمنام رکھنا چاہتے تھے مگر یہ کب ممکن تھا کہ وہ گمنام رہیں اُن پر مولانا روم کا یہ شعر صادق آتا تھا ۔

بسر منارہ اشتر رود و ندا بر آرد
کہ نہاں شدم من ایں جا مکنید م آشکارا

کیا ممکن ہے کہ بلند قامت اونٹ ایک مینار کی بلندی پر چڑھ کر یہ کہے کہ میں یہاں چھپتا ہوں میرا بھید کسی پر ظاہر نہ کرنا اور وہ فی الحقیقت نظروں سے چھپا رہے ، تمام وہ انسان جو قوم کی خاطر اپنی ہستی کو بھول جاتے ہیں اور اپنی شخصیت کو مٹانے پر کمر بستہ رہتے ہیں یہ ممکن نہیں کہ اُن کی ذات گمنام ہو جائے اور اُن کا نام و نشان دنیا میں چاند سورج بن کر نہ چمکے۔ نواب محسن الملک کی اسی بے نام و نمود رہ کر کام کرنے کی عادت نے اُن کو دنیائے اسلام کا مسلم الثبوت قومی لیڈر بنا دیا تھا ۔



مولانا شبلی [1]

آج ہماری قدیم تعلیم و تربیت کی ایک اور یادگار مٹ گئی جدید تعلیم ایک مدت سے جاری ہے اور آج سیکڑوں، ہزاروں تعلیم یافتہ بڑی بڑی خدمات پر ممتاز ہیں لیکن قومی علم ابھی تک ان ہی لوگوں کے ہاتھ میں ہے جنھوں نے کالجوں کے ایوانوں میں نہیں بلکہ مکتب کی چٹائیوں پر تعلیم پائی ہے، جدید تعلیم بھی انہیں کی بدولت پھیلی اور آج خود جدید تعلیم یافتہ گروہ اُنہیں کے اشاروں پر حرکت کر رہا ہے۔

لوگوں کو ڈر تھا کہ سرسید مرحوم کے بعد اُن کے منصوبوں کو کون انجام دے گا لیکن خدا نے اُنہیں کے ہم نشینوں میں سے ایسا شخص (نواب محسن الملک) پیدا کر دیا جو اور امور میں گو سرسید کا ہمسر نہ تھا لیکن کالج کی ترقی وُسعت اور مقبول عام بنانے میں سرسید سے کسی طرح کم نہ تھا۔ اس نے اتنی تھوڑی مدت میں سات آٹھ لاکھ روپیہ جمع کر دیا کالج کی ہر شاخ اس قدر ترقی کر گئی کہ اگر کوئی شخص جس نے سرسید مرحوم کی زندگی میں کالج کو دیکھا تھا آج جاکر دیکھے تو اُس کو کالج کا پہچاننا مشکل ہوگا کانفرنس جو روز بروز مردہ ہوتی جاتی تھی مرحوم نے اُس کو دوبارہ زندہ کیا اور لاہور سے لے کر ڈھاکہ تک اُس کے ڈانڈے ملا دیئے۔

مرحوم ذاتی صفات کے لحاظ سے بھی نادرۂ روزگار تھے۔ اس درجہ، اس عزت اور اس رتبہ پر اُن کے اخلاق کا یہ حال تھا کہ ادنیٰ درجہ کے آدمیوں سے بھی بہ ادب و عزت ملتے تھے۔ ملاقات میں ہمیشہ پیش قدمی کرتے تھے۔ سب سے جھک کر ملتے تھے۔ اُس کے ساتھ نہایت فراخ حوصلہ، فیاض، سخی اور جواد تھے اور یہی اوصاف تھے جن کی وجہ سے اُنھوں نے ایک عالم کو مسخر کر لیا تھا۔

---

[1] مولانا شبلی سرسید کے زمانہ میں عرصہ تک کالج میں پروفیسر رہے۔ جدید تعلیمی تحریک کی اشاعت میں اُن کا زبردست حصہ ہے۔ نواب محسن الملک کے زمانہ میں اکثر کالج میں آتے رہتے تھے اور اُن کی خواہش و کشش سے سال میں چند ماہ کالج میں رہ کر اسلامیات سے متعلق لکچر دینا بھی منظور کر لیا تھا۔ ندوہ کی ترقی دار المصنفین کا قیام و سیرت نبوی صلعم کی تالیف اُن کے کارہائے عظیم ہیں۔ رحلت ۱۹۱۴ء

تصنیف وتالیف کے میدان میں بھی وہ مشاہیر کے ہمسر تھے۔ اُن کا ایک خاص لٹریچر
ہے جو انہیں کے ساتھ مخصوص ہے۔ قوت تقریر میں بھی وہ نہایت ممتاز تھے۔

ظاہری صورت وشان سے بھی خدا نے اُن کو کافی حصہ دیا تھا۔ اُن کے چہرہ سے
شان ٹپکتی تھی اور گو وہ سید تھے لیکن تاتاری استخوان کا دھوکہ ہوتا تھا۔

اخیر عمر میں اُن کو کالج کے لڑکوں کی شورش کا بہت صدمہ ہوا۔ کہتے تھے کہ میں اس
رنج سے گھلتا جاتا ہوں اور واقع میں میں نے اُن کو جب شملہ جاتے ہوئے دیکھا تو اُن کی
صورت دیکھکر گھبرا گیا کہ اب یہ آفتاب لب بام آپہنچا۔

محسن الملک!! جا اور خوش خوش خدا کے سایۂ رحمت میں آرام کر۔ تو درد بھرا
دل رکھتا تھا۔ لوگ بھی تیرے لیئے روئیں گے اور بہت روئیں گے۔

در روزگار عشق تو ماہم فسانہ شدیم
افسوس کز قبیلۂ مجنوں کسے نماند

نواب معید الملک سر سید علی امام[1]
سابق لا ممبر گورنمنٹ آف انڈیا
وصدر اعظم دولت آصفیہ

حضرات، اُن کی کس کس خوبی کو یاد کیا جائے وہ ایسے جامع کمالات انسان تھے جن کی مثل اور نظیر مشکل سے نظر آئے گی اُن کا علم اُن کا حلم اُن کا وقار اُن کی کوشش اُن کی محنت اور اُن کی ہر ایک سے سچی محبت اور سب سے بڑھ کر اپنی درماندہ قوم کا درد یہ سب ایسی
چیزیں ہیں اور ایسی باتیں ہیں جن کا دل سے بھلانا آسان بات نہیں ہے،

اُن کی خدمت میں عزت حاصل کرنے کو مجھے کچھ بہت زمانہ نہیں گذرا لیکن میں اس
کیفیت کو بیان نہیں کر سکتا کہ اُن کے انتقال سے میرے دل پر کیسی چوٹ لگی ہے میں اس

---

[1] پٹنہ کے مشہور و معروف بیرسٹر تھے منٹو مارلے ریفارم اسکیم کے نافذ ہونے پر پہلے مسلمان تھے جو حکومت
ہند کی اگزیکیٹو کونسل کے ممبر ہوئے۔ رحلت ۱۹۳۳ء

کیفیت کو بیان نہیں کر سکتا کہ اُنہوں نے کیوں کہ میرے دل کو تسخیر کر لیا اُن کی شفقت وعنایت کی باتیں اور محبت کی تحریریں میرے لیئے اب کہانیاں ہیں، آپ سے کیا کہوں وہ میرے اور میری قوم کے لئے کیا تھا وہ میرا اکرم تھا وہ میرا شفیق تھا، میرا محسن تھا اور واقعی محسن تھا ...... مجھے اُمید ہو کہ جیسے اس کی زندگی ہمارے لیئے باعث برکت تھی ویسے ہی اُس کی یادگار قائم کرکے اُس کی موت بھی ہمارے لئے رحمت ثابت ہوگی، اُس کی زندگی ہماری زندگی کے لئے ایک نمونہ ہے جس کی پیروی کے لئے کوشش کرنا ہر فرد قوم کا فرض ہونا چاہیئے۔

سر آدم جی پیر بھائی[1] میں نے اپنی افتتاحی تقریر کے شروع میں نواب محسن الملک کا نام لیا ہے اُن کی وفات ایسے نازک وقت میں ہماری قوم کے لئے ایک صدمۂ عظیم ہے قوم کے لئے اُن کی خدمات کی کبھی اتنی ضرورت نہ تھی جتنی کہ آج کل تھی اُنھوں نے شملہ ڈپوٹیشن کی کامیابی کے لئے نہایت سخت محنت کی یہ امر کسی قدر باعث اطمینان ہے کہ اُنھوں نے آخر کار اپنی محنت کے ابتدائی نتائج دیکھ لئے اُن کے کام کی عام طور سے تعریف کی گئی، کیوں کہ صرف ایک مقصد یعنی اپنی قوم کو مستقل ترقی دینا اُن کو مدّنظر تھا ہم کو ایسے بہت سے سرگرم اور خالص ہمدردان قوم اور محبان وطن کی ضرورت ہے جیسے کہ نواب محسن الملک مرحوم تھے اور میں اس کام کو سب سے بہتر کام جانتا ہوں کہ اپنی قوم کے نوجوانوں سے درخواست کروں کہ وہ نواب صاحب مرحوم کی زندگی اور کارناموں کا مطالعہ کریں اور اُن کی اعلیٰ مثال کی پیروی۔

---

[1] بمبی کے مشہور تاجر جنھوں نے سب سے پہلے ۱۹۰۶ء میں ایم اے او کالج کو ایک مشت ایک لاکھ دس ہزار روپیہ عطا کیا تھا نواب صاحب کے بڑے دوست اور عقیدت مند تھے، یہ اقتباس اُن کی تقریر صدارت مسلم لیگ ۱۹۰۶ء سے لیا گیا ہے۔

نواب[1] وقار الملک

نواب محسن الملک مرحوم کی رحلت کا حادثہ ایسا سخت اور پُر افسوس اور جانکاہ حادثہ ہے کہ الفاظ کے ذریعہ سے اُس کو ادا نہیں کیا جا سکتا۔ اُن کے اوصاف حمیدہ اور اُن کی خوبیاں دائرہ تعریف سے باہر ہیں اُن کی موت مسلمانوں کے حق میں قومی مصیبت ہے۔

مدرسۃ العلوم مسلمانان علی گڑھ کے ساتھ تعلق قائم ہونے سے پہلے بھی مرحوم ہمیشہ قومی کاموں میں حصّہ لیتے تھے۔

سرسید احمد خاں مرحوم کے جدید فلسفہ نے جب تمام ہندوستان کے مسلمانوں میں ایک عام اضطراب پیدا کر دیا تھا تو وہ مہدی علی ہی تھے جن کے پُرزور قلم نے اس آگ پر پانی ڈالا اور اُس کو اس قدر ٹھنڈا کر دیا کہ لوگوں نے اُس جدید فلسفہ پر غور کرنا شروع کیا۔

جو عام دلچسپی تہذیب الاخلاق کو عامۂ خلائق میں حاصل ہوئی وہ زیادہ تر اُنہیں مضامین کی وجہ سے تھی جن کے آخر میں مہدی علی کا پیارا نام لکھا ہوا تھا۔

علی گڑھ کالج کی جس وقت بنیاد رکھی گئی ہے اور جب اس کا اسکول قائم ہوا تو وہ مہدی علی ہی تھے جن کے حسن سعی سے نواب سر سالار جنگ مرحوم و مغفور نے اس کی ابتدائی مدد ریاست حیدرآباد سے اور نیز اپنی ذات خاص سے منظور فرمائی اور جب تک محسن الملک نے حیدرآباد کو چھوڑا اُس وقت سے اپنے دم واپسیں تک اپنی تمام قوت اور توجہ

---

[1] نواب وقار الدولہ وقار الملک مولوی مشتاق حسین اور نواب محسن الملک ۱۸۶۹ء سے رفیق کار تھے اس چہل سالہ تعلق میں نواب وقار الملک اُن کے دوست اور حقیقی غم خوار ہی نہ تھے بلکہ اُن کی سرکاری و قومی زندگی دونوں سے محتسب تھے۔ جنوری ۱۹۰۸ء سے جولائی ۱۹۱۲ء تک ایم، اے، او، کالج کے آنریری سکریٹری رہے۔ جنوری ۱۹۱۷ء میں بمقام امروہہ رحلت کی۔ یہ مضمون اُنہوں نے اس اپیل کی صورت میں لکھا تھا جو نواب محسن الملک کی یادگار قائم کرنے کے لئے کی تھی۔

کو کالج ہی میں صرف کرتے رہے یا یوں کہنا چاہیئے کہ اپنی زندگی ہی کالج کے نذر کر دی۔

سرسید کے انتقال کے بعد قوم میں کالج کی طرف سے عام بے چینی پھیل گئی تھی، مگر یہ اُنہیں کا کام تھا کہ اُس بے چینی سے فائدہ اُٹھایا اور کالج کو اُس عروج پر پہنچایا جو اُسے پہلے نصیب نہیں ہوا تھا۔

کالج کو یونیورسٹی کے درجہ تک پہنچانے کا خیال قوم کے سامنے پیش کیا جس نے قوم کے مایوس دلوں کو زندہ کر دیا۔

یہ نواب صاحب ہی کی کوشش کا نتیجہ تھا کہ کانفرنس "آل انڈیا کانفرنس" کہلائے جانے کی مستحق ہوئی۔

مرحوم کی خدمات جدید اسلامی فلسفہ کی اشاعت اور مسلمانوں کی تعلیم کو ترقی دینے ہی تک محدود نہیں تھیں، بلکہ اس کے علاوہ بہت بڑا حصہ مسلمانوں کے پولیٹکل حقوق کی حفاظت کا بھی ان میں شامل تھا جس کے لئے جناب ممدوح قوم کی طرف سے خاص شکر گذاری کے مستحق ہیں اور خصوصًا ان کا سب سے آخری کارنامہ مسلمانوں کا وہ ڈپوٹیشن ہے جو تمام مسلمانان ہندوستان کی طرف سے یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو بمقام شملہ حضور وبسرائے کی خدمت میں حاضر ہوا اور جس نے گورنمنٹ سے مسلمانوں کے اُن حقوق کو تسلیم کرا لیا جو اب تک مبہم حالت میں چلے آرہے تھے اور اپنی زندگی کے آخر دنوں میں گو کہ بظاہر جناب مرحوم کا سفر شملہ محض تفریحی سفر معلوم ہوتا تھا لیکن درحقیقت اس کو بہت بڑا تعلق گورنمنٹ آف انڈیا کے جدید رفارم اسکیم کے اُس حصہ سے تھا جو مسلمانوں سے متعلق ہے اور جس کو جناب مرحوم حتی الامکان مسلمانوں کے حق میں زیادہ تر مفید بنانے کے لئے بغیر کسی ظاہری نام و نمود کے کوشش کر رہے تھے لیکن ۱۶ اکتوبر کی شام نے اُن سب اُمیدوں کا خاتمہ کر دیا۔

اُن تمام قومی خدمات کے ساتھ اُن کا حسنِ اخلاق اور انکسار نفس اور بے نظیر تحمل اور

بے مثال فروتنی اُس حد کو پہنچی ہوئی تھی کہ بہت سے مواقع پر مرحوم کے دوست اور نیاز مند اُس کو حد سے بڑھا ہوا پا کر معترض ہونے لگتے تھے اور اُس کا نتیجہ یہ تھا کہ مرحوم کی غایت شان دار زندگی کے ساتھ ہی اُن کی بے ریا سخاوت اور سیر چشمی کی حد کسی کو کبھی معلوم ہی نہ ہونے پائی۔

عامۂ خلائق میں اُن کو اس قدر ہر دل عزیزی کا منصب حاصل تھا جس سے مافوق کوئی حاصل نہیں کر سکتا۔ اسی کے ساتھ جو خدمات کہ اُنہوں نے قوم اور ملک کی انجام دیں گورنمنٹ نے بھی اُن کو اُسی اعتماد اور منزلت کی نگاہ سے دیکھا جس اعتماد اور منزلت کی کہ وہ خدمات مستحق تھیں اور گورنمنٹ کی نگاہ میں جو وقار کہ جناب مرحوم نے حاصل کیا تھا اُس کا بہت ثبوت اب مل رہا ہے۔

الغرض نواب محسن الملک بہت سی خوبیوں کا مجموعہ تھے اُن کے اُس ناوقت رحلت کر جانے سے قوم نے اپنا ایک سچا محسن، سچا مربی، سچا خادم، سچا مخدوم کھو دیا ہے جس کے رنج و غم میں اس وقت قوم ماتم کر رہی ہے اور نہ صرف مسلمان بلکہ دوسری قوموں کے اکثر معزز بزرگوار بھی اس سوگ میں ہمارے شریک حال ہیں۔

کشمیر سے لے کر مدراس تک اور بمبئی سے برہما تک ہر جگہ "ہائے محسن الملک"! کی آواز آرہی ہے اور ہر جگہ سے ہمدردی کے تار اور پیام آرہے ہیں اور بدون کسی خاص تحریک کے یہ عام خواہش پیدا ہوگئی ہے کہ ایک ایسے محسن قوم اور محسن الملک کو یوں مرنے نہ دو اور اُس کی کوئی شان دار یادگار قائم کر دو جس سے اُس کی یاد نسلاً بعد نسلٍ قوم میں شکر گزاری کے ساتھ تازہ اور اُس کا پیارا نام و خطاب ہمیشہ زندہ رہے اور اُس کی روح کو ابدی خوشی حاصل رہے۔

محسن الملک نے جس طرح قوم پر ایک عاشق زار کی طرح اپنی جان نثار کی ہے اسی طرح قوم بھی اُس کی ایک علمی یادگار اُسی کے مذاق طبیعت اور قوم کی ضروریات اور اپنے قومی

درجہ کے مناسب قائم کرکے اُس کو ہمیشہ زندہ رکھے۔

عاشق نہ کبھی مرے ہیں نہ مریں گے۔ جب تک معشوق کا نام باقی ہے یعنی قوم باقی ہو عاشق بھی زندہ ہیں۔

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

سر جان ہیوٹ[۵۱] لفٹنٹ گورنر صوبہ متحدہ و پیٹرن کالج

آپ نے اپنے ایڈریس میں ٹرسٹیوں کے اُس نقصان کا حوالہ دیا ہے جو نواب محسن الملک مرحوم کی وفات سے پہنچا ہے آپ کو یاد ہوگا کہ اب سے ٹھیک دس سال پہلے جب وہ اس کالج کے آنریری سکرٹری ہوئے تھے تو وہ زمانہ کالج کے لئے کس قدر پُر آشوب تھا اُس زمانہ میں چند افسوسناک حالات کی وجہ سے جن کا میں اس موقع پر تذکرہ کرنا نہیں چاہتا کالج پر اندیشناک قرض کا بار ہوگیا تھا۔ مجھے حضرات حاضرین کو اس امر کے یاد دلانے کی ضرورت نہیں ہے کہ نواب محسن الملک کسقدر صاحبِ توقیر و منزلت تھے اور آپ بھی اس امر سے واقف ہیں کہ اگر ان کا رشتۂ حیات اس طرح یک لخت منقطع نہ ہو جاتا تو گورنمنٹ اُن کو اس کام کے صلہ میں جو اُنہوں نے آپ میں رہ کر کیا تھا خاص صلہ[۵۲] دینے والی تھی تقریباً تین سال کا عرصہ ہوا کہ مجھ سے اُن سے

---

۵۱ فروری ۱۹۰۹ء میں کالج وزٹ کے موقع پر ہز آنر نے ٹرسٹیوں کے ایڈریس کے جواب میں جو تقریر کی تھی اُس سے یہ اقتباس کیا گیا ہے۔

۵۲ ٹائمز آف انڈیا نے بھی ۲۱ جنوری ۱۹۰۸ء کی اشاعت میں لکھا تھا کہ "ہم اس خبر کو سن کر خوش ہوئے اور ہمارے نزدیک ہندوستان کے پورے طبقہ نائٹ میں نواب محسن الملک سے زیادہ کسی کا نام اس عزت کے قابل نہیں (نواب صاحب کی تعریف کے بعد) ہم ہمیشہ یہ خیال کرتے رہے کہ گورنمنٹ نے ان کی اعلیٰ پبلک خدمات کا منصفانہ اعتراف کرنے میں کسی قدر کوتاہی کی کہ ان کو تمغۂ قیصر ہند کے علاوہ اور کسی

ملاقات ہوئی تھی مگر افسوس ہے کہ پھر ان سے اٹھائیس سال تک ملاقات نہیں ہوئی اور ہوئی بھی تو کب جبکہ آپ کے طلبار کی پریشانیوں کے سلسلہ میں مجھے اُن کے ساتھ کام کرنا پڑا ان کی حیات کے آخری زمانہ میں مجھ کو معاملات کالج کے متعلق ان سے بارہا گفتگو کرنے کا موقع ہاتھ آیا، ان کی زندگی کا پہلا مطمح نظر کالج کی بہبودی تھا جسم کمزور اور نحیف ہو چکا تھا مگر روح میں وہی تیزی و شوق تھا اور اُن کے جوش و خروش کی وہی لامتناہی حالت تھی جو عالم شباب میں تھی کالج کے لیے اُن کی بڑی خدمات اُن کی جوش انگیز فصاحت و بلاغت میں تھیں جس کو وہ کالج کے لیے کام میں لائے۔ وہ بڑی شان اور قابلیت کے مقرر تھے اور اُنہوں نے کالج کی بہبودی کے لیے بغیر کسی نقصان کے اپنی قابلیتوں کو صرف کیا ایک وہ زمانہ تھا جبکہ ان کو کالج کے اغراض و مقاصد و میلان کے متعلق غلط فہمیوں کا مقابلہ کرنا پڑا پھر وہ زمانہ آیا جب کہ ان کو دل آویز طریقہ سے ترغیب و تحریص دے کر کثرت تعداد میں ایسے لوگوں کو جو سرد مہر یا مخالف تھے، یہ ذہن نشین کرنے کے لئے کھینچنا پڑا کہ مسلمانوں کے ارتقار کا خاص ذریعہ یہ کالج ہی ہے اگر سر سید نے اپنی حیات میں مسلمانوں کی مرکزی تعلیمی درس گاہ کا خیال پیدا کیا اور اس کی محفوظ بنیاد ڈالی تو ہندوستان کے تمام حصص میں اس خیال کو ہر دلعزیز کرنے کا سہرا نواب محسن الملک ہی کے سر رہا۔ جن کی عجیب و غریب خداداد قابلیتوں نے ان کو بہ نسبت کسی اور شخص کے اس کام کے لئے زیادہ موزوں ثابت کیا۔ سن رسیدہ ہونے کے باوجود بھی وہ جس محنت و ذوق سے کالج کی امداد کے لئے ہندوستان میں دورہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸۸) اعلیٰ اعزاز کے عطا کرنے کے بغیر مر جانے دیا۔ لیکن اس بات سے کسی قدر اشک شوئی ہو جاتی ہے کہ اگر وہ زندہ رہتے تو اُن کے کاموں کی زیادہ مناسب طور پر قدر کی جاتی اور اس اطلاع سے مرحوم نواب کے دوستوں کو اطمینان ہوگا اور ہم کو بھی بیّن طور پر معلوم ہو گیا کہ اُن کا خاموش کام سرچشمۂ اعزازات پر فراموش نہیں ہوا۔

کرتے تھے یہ امر ہمارے دل میں ان کی عظمت و توقیر پیدا کرتا تھا اور پبلک میں دلچسپی پیدا کرنے میں ان کو جو کامیابی ہوئی اُس کا یہ بہترین اور بدیہی ثبوت ہے کہ کالج کو بڑے بڑے چندے دئے گئے اور ایسے دور و دراز کے مقامات سے جیسے کہ بمبئی اور رنگون جو ایک دوسرے سے اس قدر زیادہ فاصلہ پر واقع ہیں۔

ان کی یادگار قائم رکھنے کے لئے اس سے بڑھ کر اور کوئی زیادہ موزوں تجویز نہیں ہو سکتی کہ آپ اپنے کالج اور اس کی عمارتوں میں مزید نشو و نما کے لئے سرمایہ جمع کریں اس کا یہ نتیجہ ہوگا کہ آنے والی نسلیں ایک ایسے شخص کو یاد کریں گی جس کی جانفشانی اور جس کے پیدا کئے ہوئے جوش و خروش نے ایسی مصیبت کے وقت کالج کی جان بچائی جبکہ کوئی شخص جس میں اُن کی سی قابلیت موجود نہ تھی ایسی امداد نہیں پہونچا سکتا تھا جس قدر کہ انھوں نے کامیابی کے ساتھ پہونچائی۔

جو کچھ وعدہ میں کہہ سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ جب اس فنڈ کی امید افزا حالت ہوگی تو لوکل گورنمنٹ بھی فنانشل حالت کے لحاظ سے آپ کی مدد کرے گی۔ مجھے ولیسرائے نے ہدایت کی ہے کہ آپ نے جو کام ہاتھ میں لیا ہے اُس کے ساتھ ہمدردی ظاہر کروں اور جس میں ہزاکسلنسی خود عطیہ[1] دیں گے اور مجھے بھی اس میں شرکت کرنے سے بہت خوشی ہوگی۔

---

[1] ہز آنر اور ہزاکسلنسی نے پانچ پانچ سو چندہ عطا کیا۔



محسن الملک

از

(مولوی عبدالحق صاحب بی اے۔ پروفیسر جامع عثمانیہ ومعتمد انجمن ترقی اُردو)

قدرت نے نواب محسن الملک مرحوم کو بہت سی خوبیاں عطا کی تھیں، وجاہت ذہانت، خوش بیانی اور فیاضی اُن کی ایسی عام اور ممتاز صفات تھیں کہ ایک راہ چلتا بھی چند منٹ کی بات چیت میں معلوم کر لیتا تھا۔ خطاب یا نام اٹکل سے رکھ دیئے جاتے ہیں مسمیٰ کی خصوصیات کا ان میں مطلق لحاظ نہیں ہوتا۔ نام رکھتے وقت تو ممکن ہی نہیں عطائے خطاب کے وقت بھی اس کا خیال نہیں کیا جاتا۔ لیکن محسن الملک کا خطاب ان کے لئے بہت ہی موزون نکلا۔ ان میں پارس پتھر کی خاصیت تھی۔ کوئی ہو، کہیں کا ہو اُن سے چھوا نہیں اور کندن ہوا نہیں۔ اگر کسی نے سلام بھی کر لیا تو اُن پر اس کا بار رہتا تھا اور جب تک اس کا معاوضہ نہ کر لیتے انھیں چین نہ آتا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے دشمن کو بھی نہیں بھولتے تھے اور یہ میں ذاتی علم سے کہتا ہوں کہ وہ بھی اُن کے زیر بار منت تھے۔ سیاسی مصلحتیں بعض اوقات اہل حکومت کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ اُن افراد کو جو اُن کی یا حکومت کی راہ میں حائل ہیں۔ دودھ کی مکھی کی طرح نکال کے پھینک دیں۔ مرحوم کو بھی کبھی کبھی ایسا کرنا پڑتا، لیکن اُنھوں نے اس ناگوار اور دل شکن کام کو اس خوبی اور سلیقہ سے کیا کہ مخالف ہونے پر بھی محسن الملک کو دعائیں دیتے گئے اور جب تک زندہ رہے اُن کے شکر گزار رہے۔

وہ جوہر قابل تھے مگر موقع کی تاک میں تھے۔ حیدرآباد میں اُن کی سیاست دانی تدبیر انتظامی قابلیت کے جوہر کھلے۔ ریاستوں میں نوکری کرنا اور اپنی ذمہ داریوں سے

عہدہ برآ ہونا آسان نہیں۔ وہاں سازشوں، ترغیبوں اور پیچیدگیوں کا ایسا جال بچھا ہوتا ہے کہ بڑے بڑے تیز نظر اور ہوشمند بھی پھنسے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اور اگر کچھ کرنا ہے تو دانستہ یا نادانستہ، بالواسطہ یا بلاواسطہ پھنسنا ہی پڑتا ہے۔ البتہ فرق اتنا ہے کہ اکثر تو ذاتی اغراض کے لئے یہ سب جتن کرتے ہیں۔ مگر خاص خاص لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ریاست کی بہبودی کی خاطر اپنا سر اوکھلی میں دیدیتے ہیں۔ ان چند مخصوص لوگوں میں نواب محسن الملک کا بھی شمار ہے۔ اس اکھاڑے میں اترنا اور زندہ نکل آنا اصل حکمت اور تدبر ہے اور یہ کوئی محسن الملک سے سیکھتا۔ انھیں ان جھگڑوں میں پھنسنا پڑا، بعض اوقات کرہاً اور بعض اوقات طوعاً، لیکن اُنہوں نے کبھی ریاست کے مفاد کو ذاتی اغراض پر قربان نہیں کیا۔ وہ کوئلوں کی اس کوٹھری میں گئے مگر ہمیشہ بے داغ نکل آئے۔ لیکن باوجود اس قدر مدبر، ہوشمند اور شاطر ہونے کے آخر وہ خود بھی اسی کا شکار ہوئے۔

ریاستوں میں دو گونہ مصیبت ہوتی ہے۔ ایک اندرونی، دوسری بیرونی پچاس برس پہلے کا ذکر ہے اب رنگ بہت کچھ بدل گیا ہے، خود مختار حکومتوں میں ایک بڑا عیب یہ ہوتا ہے کہ ان میں سازشوں کی بہت گنجائش ہوتی ہے۔ ہر شخص کی (خواہ وہ کوئی ہو) یہ کوشش ہوتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح "سرکار" کو خوش کر لیا جائے جس سے "دپیا" خوش اُسی کا راج۔ اس سعی میں رقابت شروع ہوتی ہے اور رقابت سے طرح طرح کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا سلسلہ چلتا ہے۔ اس کشمکش میں کذب و افترا، بہتان، مخبری، غرض کوئی ایسی کمینہ حرکت نہیں ہوتی جو حریف ایک دوسرے کے خلاف کام میں نہ لاتے ہوں۔ یہ ایک عجیب اسرار ہے جس کا سلسلہ شاخ در شاخ دُور دُور پہنچتا ہے اور عجیب رنگ میں ظہور پذیر ہوتا ہے اور ایسے حیرت انگیز نتائج پیدا ہوتے ہیں جن کا سان گمان بھی نہیں ہوتا۔ یہ بڑی طویل داستان ہے، اس

کی تفصیل کو دفتر درکار ہیں۔ اس کے لئے بعض لوگوں کے دماغ خاص طور پر موزوں ہوتے ہیں۔ یہاں علمی قابلیت اور فضیلت کام نہیں آتی، یہ کوچہ ہی دوسرا ہے۔ بعض لوگ دیکھنے میں بالکل بدّھو معلوم ہوتے ہیں (اور ہوتے بھی ایسے ہی ہیں) لیکن بلا کے سازشی ہوتے ہیں اور اُن کا دماغ ان معاملات میں ایسا رسا ہوتا ہے کہ اُن کے کارنامے دیکھکر بڑے بڑے مدبّر اور قابل لوگ ششدر رہ جاتے ہیں۔ جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس میں یہ چیزیں خوب پھلتی پھولتی تھیں۔

یہ تو ہوئی ایک مصیبت اور اندرونی۔ اب دوسری مصیبت کا حال سنیئے جو بیرونی ہے۔ والئے ریاست اپنے علاقے کا حاکم با اختیار ہے، سیاہ و سفید کا مالک ہے، لیکن اس کے ساتھ ایک ایسی پخّر لگی ہوئی ہے، جس کے سامنے سارے اختیارات دھرے رہ جاتے ہیں۔ یہ ایک عجیب و غریب شخص ہوتا ہے، نہ صاحب اختیار ہے، نہ صاحب جاہ و منصب، نہ غیر معمولی قابلیت اور ذہانت رکھتا ہے، لیکن سب کچھ سمجھا جاتا ہے اور سب کچھ کر گزرتا ہے، یہ رزیڈنٹ بہادر ہیں۔ راج پاٹ تو "حضور" کا ہے لیکن اس کنکوّے کی ڈور "صاحب عالی شان بہادر" کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ یہاں بڑے بڑے مدعیوں کے دعوے باطل ہو جاتے ہیں اور بڑے بڑے مدبّروں کی تدبیریں بے سود ثابت ہوتی ہیں۔ "بڑے صاحب" کی نظر پھری تو ایک دُنیا پھر جاتی ہے۔ بعض اوقات "رزیڈنسی" اور "پیلس" دو بڑی رقابت گاہیں ہو جاتی ہیں۔ پھر ایک طرف فارن آفس اور گورنمنٹ اور دوسری طرف ارکان ریاست اور مصاحبین حضور، ایک دوسرے سے اُلجھ جاتے ہیں۔ حسد اور رقابت "پرسٹیج" اور ربات کی پیچ بیچ میں آپڑتی ہے جس کی وجہ سے سازشوں کا بازار گرم ہو جاتا ہے اور ایسے پیچ پیچ پڑنے شروع ہوتے ہیں کہ اصل معاملہ تو الگ رہ جاتا ہے اور بات کچھ کی کچھ ہو جاتی ہے، بعض اوقات حالت ایسی نازک ہو جاتی ہے کہ حکومت تو

رہی ایک طرف، جان کے لالے پڑجاتے ہیں۔ اس پُرپیچ گتھی کو اس طرح سلجھانا کہ سانپ مرے اور لاٹھی نہ ٹوٹے، رزیڈنٹ بہادر بھی خوش رہیں، ریاست کے وقار کو بھی زیادہ صدمہ نہ پہونچے اور اصل معاملہ (جو کچھ بھی نہ تھا) اس طرح طے ہو جائے کہ طرفین کو کچھ عذر نہ ہو، ریاست کے انتظام میں سب سے بڑا کمال سمجھا تا ہے۔ یہ کمال نواب محسن الملک کا خاص حصہ تھا۔ اُن کا ذہن ایسا رسا، اُن کی طبیعت ایسی حاضر، اُن کے اوسان ایسے بجا اور معاملات اور واقعات پر ایسا عبور تھا کہ بڑے بڑے پیچیدہ معاملات کو باتوں باتوں میں سلجھا دیتے تھے۔ وہ اگر ٹرکی یا کسی اور سلطنت کے فارن منسٹر ہوتے تو یقیناً دنیا میں بڑا نام پیدا کرتے۔ بڑے بڑے مدبّران کا لوہا مان گئے تھے۔

یوں تو انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے نواب صاحب مرحوم کے احسانات حیدرآباد اور اہل حیدرآباد پر بے شمار تھے لیکن ریاست کے نظم و نسق میں چند چیزیں خاص اُن کی یادگار رہیں۔ مثلاً ریاست کا پہلا بجٹ نواب صاحب نے مرتب کیا اور یہ مصر کے بجٹ کے نمونے پر تھا جو وہاں انگریزی نگرانی کے بعد پہلی بار تیار ہوا تھا۔ بندوبست کا محکمہ بھی انھیں کا قائم کیا ہوا ہے جس نے اراضی کی پیمائش کا کام کیا۔ اس کے علاوہ فنانس اور مالگزاری میں بہت سی اصلاحیں کیں جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، یہ اُن کے سوانح[1] نویس کا کام ہے۔

حیدرآباد میں بڑے بڑے آئے اور گئے لیکن اب تک کسی کو وہ عام مقبولیت اور ہردلعزیزی حاصل نہیں ہوئی جو نواب محسن الملک کو ہوئی۔ ہمارے ملک میں خوشامدیوں کی کوئی کمی نہیں وہ ہر بڑے اور صاحب اقتدار آدمی پر اس طرح ٹوٹ کر گرتے ہیں جیسے شہد پر مکھیاں، لیکن سچ اور جھوٹ کا امتحان اس وقت

---

[1] افسوس ہے کہ مؤلف اس دشوار راستہ کو طے نہ کرسکا۔

ہوتا ہے جب وہ بڑا آدمی اپنے اقتدار یا منصب سے محروم ہو جاتا ہے۔ نواب محسن الملک کی رخصت کے وقت حیدرآباد میں کہرام مچ گیا تھا اور ہزارہا آدمی کا ٹھٹھ اسٹیشن کے باہر اور اندر لگا ہوا تھا۔ سینکڑوں آدمی جس میں امیر غریب، بیوائیں اور یتیم سب ہی تھے، زار و قطار رو رہے تھے۔ وہ کیا چیز تھی جس نے چھوٹے بڑے سب کا دل موہ لیا تھا۔

جس زمانے میں نواب صاحب پیدا ہوئے اور ہوش سنبھالا مسلمانوں میں مذہبی جذبہ بہت بڑھا ہوا تھا۔ اس کے متعدد اسباب تھے ان میں سے شاید ایک یہ بھی تھا کہ انسان جب ہر طرف سے مایوس ہو جاتا ہے تو مذہب کی پناہ ڈھونڈھتا ہے مسلمان دولت و اقبال، جاہ و ثروت سب کچھ کھو چکے تھے، ایک مذہب رہ گیا تھا اس لئے یہ انھیں اور بھی عزیز ہو گیا تھا۔ ذرا سی بدگمانی پر بھی اُن کے جذبات بھڑک اُٹھتے تھے۔ اس وقت شاید ہی کوئی ایسا مسلمان مصنف یا ادیب ہو جس نے مذہب پر قلم فرسائی نہ کی ہو۔ یہاں تک کہ وہ لوگ جنھیں مسلمان نیچری کہتے تھے اور اپنے خیال میں بد مذہب و بدعقیدہ سمجھتے تھے۔ ان کا اوڑھنا، بچھونا بھی مذہب تھا سرسید تو خیر ان کے سردار ہی تھے، ان کے حلقے کے دوسرے رکن بھی مثلاً نواب محسن الملک، حالی، مولوی مشتاق حسین، شبلی، چراغ علی، نذیر احمد وغیرہم خواہ کچھ ہی لکھتے لیکن تان مذہب ہی پر ٹوٹتی تھی۔ نواب صاحب مرحوم کو ابتدا سے مذہبی لگاؤ تھا، پہلے وہ میلاد پڑھتے اور وعظ کہتے تھے؛ نیچری ہونے پر لکچر دینے اور مضامین لکھنے لگے لیکن ان سب کا تعلق کسی نہ کسی پہلو سے مذہب سے ہوتا تھا، ان کی ایک ہی تصنیف ہے جو خالص مذہبی ہے۔ ورنہ اس کے سوا اُن کی جتنی تحریریں ہیں وہ یا تو تعلیمی ہیں یا معاشرتی یا علمی لیکن ان سب کا تعلق کسی نہ کسی نہج سے اسلام یا مسلمانوں سے ہے۔ گو وہ اُردو کے اعلیٰ درجے کے ادیبوں میں نہیں لیکن اُن کی

تحریر میں ادبیت کی شان ضرور پائی جاتی ہے۔ روانی، فصاحت، تسلسل بیان ان کے کلام میں نمایاں طور پر پایا جاتا ہے۔ اگرچہ انگریزی نہیں جانتے تھے لیکن انگریزی کتابیں پڑھوا کر سنتے اور ترجمہ کرا کر مطالعہ کرتے تھے۔ اُن کے مضامین میں مغربی خیالات کی ترجمانی صاف نظر آتی ہے۔

تقریر کے وقت منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ آواز میں شیرینی اور دلکشی تھی، اکثر لوگ جو اُن سے ملنے یا کسی معاملے میں گفتگو کرنے آتے تو اُن کی ذہانت اور لیاقت کے قائل ہو کے جاتے۔ ان کی خوش بیانی ایسی تھی کہ اکثر اوقات مخالف بھی مان جاتے تھے۔ دکن میں رہتے رہتے اور بعض امراض کی وجہ سے بھی وہ شدید موسم کی برداشت نہیں کر سکتے تھے، ایسے زمانے میں وہ بمبئی چلے آتے تھے۔ بدرالدین طیب جی، سر سید احمد خاں کے مشن اور علی گڑھ کالج کے بہت مخالف تھے، ایک دن نواب صاحب نے بدرالدین طیب جی سے ایسی فصیح اور پُر درد تقریر کی کہ دونوں آبدیدہ ہو گئے اور تھوڑی سی دیر میں اُن کی دیرینہ مخالفت کو ہمدردی سے بدل دیا اور ایک گراں قدر عطیہ کالج کے لئے اُن سے وصول کر لیا۔ بمبئی میں جب آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ہوا تو اس کے صدر بھی بدرالدین طیب جی ہوئے۔ بڑے بڑے جلسوں میں جب معاملہ بگڑنے لگتا اور یہ اندیشہ پیدا ہو جاتا کہ کہیں جلسہ درہم برہم نہ ہو جائے تو اُس وقت نواب صاحب کی خوش بیانی، فصاحت اور ظرافت جادو کا کام کر جاتی تھی اور منتقض اور مکدر چہرے بشاش اور شگفتہ ہو جاتے تھے۔ ان کی باتوں اور تقریروں میں ظرافت کی چاشنی بڑا مزہ دیتی تھی۔ باتوں میں ظرافت کبھی کبھی شوخی کی حد تک پہونچ جاتی تھی۔

دوسروں سے کام لینے کا انھیں بڑا اچھا سلیقہ تھا۔ وہ کچھ ایسے مہر آمیز طریقے سے کہتے تھے اور اس طرح سے ہمت افزائی کرتے تھے کہ لوگ خوشی خوشی ان کا کام

کرتے تھے۔ اپنے ملازموں اور ماتحتوں سے بھی ان کا حسن سلوک ایسا تھا کہ وہ اُن کی فرمائش کی تعمیل ایسی تن دہی اور شوق سے کرتے تھے جیسے ان کا کوئی ذاتی کام ہو اور وقت پر جان لڑا دیتے تھے۔

آدمی کے پہچاننے میں انھیں خاص ملکہ تھا۔ تھوڑی سی ملاقات اور بات چیت میں آدمی کو پوری طرح بھانپ لیتے تھے۔ اُن کے ملنے والے بُرے اور بھلے ہر قسم کے آدمی تھے۔ دنیا نیکوں ہی کے لئے نہیں اس میں بدوں کا بھی حصہ ہے اور شاید دنیا کی بہت کچھ رونق انھیں کے دم سے ہے۔ وہ دونوں سے کام لیتے تھے۔ مدبرین اور سیاست دانوں کو طرح طرح کی ضرورتیں پیش آتی ہیں اور قسم قسم کے لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے کبھی ایسا وقت آ پڑتا ہے کہ بدمعاشوں سے کام لیئے بغیر چارہ نہیں ہوتا لیکن کمال تدبر اس میں ہے کہ اُن سے کام تو لیا جائے لیکن انھیں قابو پانے کا موقع نہ دیا جائے۔ نواب صاحب اس فن کے اُستاد تھے۔ وہ بدمعاش سے کام لیتے تھے لیکن یہ سمجھ کر کہ وہ بدمعاش ہے اور ہمیشہ کوئی نہ کوئی بات اُس کی اپنے ہاتھ میں ایسی رکھتے کہ وہ سر نہ اُٹھا سکتا اور اُسے اُن کی اس کمزوری سے فائدہ اُٹھا کر اُن پر قابو پانے کا موقع نہ ملتا۔

اُن کا ذوق نہایت نفیس اور پاکیزہ تھا۔ رہنے سہنے، کھانے پینے، پوشاک غرض ان کی ہر چیز میں نفاست پائی جاتی تھی۔ جن لوگوں نے حیدرآباد میں نواب صاحب کی کوٹھی (جو اب بھی کوٹھی محسن الملک کہلاتی ہے) دیکھی تھی وہ اس کی داد دے سکتے ہیں۔ مسلمانوں میں مغربی معاشرت کی شیفتگی سرسید مرحوم کی بدولت پیدا ہوئی۔ یہاں اس سے بحث کرنے کی ضرورت نہیں کہ اس سے اُن کا کیا منشا تھا اور اُن کا یہ خیال کن مصالح پر مبنی تھا لیکن یہ بلا آئی انھیں دونوں اور انھیں کی بدولت مسلمانوں کو اسراف کا ایک اور بہانہ مل گیا۔ اس معاملہ میں سرسید کے سب سے بڑے

اور اوّل معتقد اور خلیفہ نواب محسن الملک تھے۔ ان کی دیکھا دیکھی دوسروں پر بھی وہی رنگ چڑھ گیا۔ ان بزرگوں نے ہر چند لباس کی تراش خراش، مکانوں کی سجاوٹ اور بود و باش کے طریقے میں انگریزی تقلید کی، لیکن کھانا ان کا وہی ہندوستانی رہا اسے نہ بدل سکے۔ یہ چٹخارے انگریزی کھانوں میں کہاں؟ نواب صاحب کھانے کے بڑے شوقین تھے اور بہت نفیس اور عمدہ کھانا کھاتے تھے۔ اُن کے کھانے بہت مُرغّن ہوتے تھے۔ حیرت اس بات کی تھی کہ ایسے کھانے بغیر کسی ورزش وغیرہ کے وہ کیونکر ہضم کر لیتے تھے۔ یہی حال نواب عماد الملک مرحوم کا تھا۔ انھیں بھی کھانے کا بہت شوق تھا۔ یہ لوگ کھانے کے عیب و ہنر کو بھی خوب پرکھتے تھے۔ اِسی شوق کی بدولت وہ باورچیوں کی بڑی ناز برداری کرتے تھے۔ اُن کا باورچی جہانگیر تھا، یہ بھی اٹاوہ کا تھا، پہلے اس کا باپ یہ کام کرتا تھا وہ ضعیف ہو گیا تو جہانگیر اس کی جگہ آ گیا، خوب کھانا پکاتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں مزہ تھا۔ مگر بڑا ہی گستاخ اور بدمزاج تھا، ایک دن اس نے نہایت گستاخانہ اور نا ملائم کلمات نواب صاحب سے کہے۔ نواب صاحب خفا ہو کر اوپر چلے گئے۔ تیسرے پہر کو جب وہ نیچے آئے تو اُن کے ایک نیازمند نے عرض کیا "کیا افسوس کی بات ہے! ایسے کھانے سے تو فاقہ بہتر ہے۔" فرمانے لگے "ارے میاں تم کیا جانو یہ گالیاں نہ تھیں چٹنی تھی۔"

ایک روز نہ معلوم کیا بات ہوئی وہ خفا ہو کر چل دیا۔ اب نواب صاحب سے کھانا نہیں کھایا جاتا۔ بیگم صاحب نے طرح طرح کے کھانے پکائے، مگر جہانگیر کی بات کہاں بمبئی سے غدار شہر میں ایک سے ایک بڑھ کر ہوٹل اور ریستران، مگر کہیں کا کھانا پسند نہ آیا۔ آخر سو روپے کا منی آرڈر تار پر بھجوا دیا اور جہانگیر کو بلوایا، تب لقمہ حلق سے اُترا، کھانے کا شوق ہو تو ایسا ہو!

بمبئی ہی کا ذکر ہے کہ ایک باورچی نواب صاحب کا نام سُن کر حاضر ہوا۔ نواب

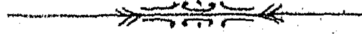
صاحب نے پوچھا، کیا کیا پکانا جانتے ہو۔ کہنے لگا، چپاتی اور قورمہ۔ نواب صاحب نے کہا ہیں! تو کیا جواب دیتا ہے کہ اصل کھانا تو یہی ہے، باقی سب نوابوں کے نخرے ہیں۔

نواب صاحب کو مطالعہ کا بہت شوق تھا۔ اخبارات اور اردو، فارسی، عربی کتابیں برابر پڑھتے رہتے تھے، انگریزی کے اخبارات اور مضامین بھی پڑھوا کر سنتے تھے۔ انگریزی کی ایسی کتابیں جو اُن کے مذاق کی ہوتی تھیں اُن کا ترجمہ کرا کر پڑھتے اور بحث کرتے تھے۔ ان کے کتب خانے میں فارسی، عربی اور انگریزی کی اعلیٰ درجے کی کتابیں تھیں۔

سرسید کی وفات کے قریب زمانے ہی میں اُردو کی مخالفت کا آغاز ہو گیا تھا اگرچہ سرسید کی حالت اس وقت نازک تھی تو بھی اس جواں ہمت بڈھے نے اس کے متعلق لکھا پڑھی شروع کر دی تھی۔ محسن الملک کے زمانے میں اس مخالفت نے اور زور پکڑا۔ اُردو کی حفاظت اور حمایت کے لئے ایک انجمن قائم کی گئی جس کا ایک عظیم الشان جلسہ لکھنؤ میں ہوا۔ اس میں نواب محسن الملک نے بڑی زبردست اور پرجوش تقریر کی جس کا لوگوں پر بڑا اثر ہوا اور جوش کی ایک لہر پھیل گئی۔ سرانٹونی میکڈانل اس وقت لفٹنٹ گورنر تھے، وہ ہندی کے بڑے حامیوں میں سے تھے۔ اس نے کچھ ایسی دھمکی دی کہ نواب صاحب کو اس سے دست بردار ہونا پڑا اور انجمن ٹوٹ پھوٹ کے رہ گئی۔ ان کی یہ کمزوری نہایت قابل افسوس ہے، لیکن اندیشہ یہ تھا کہ اگر انھوں نے اس پر اصرار کیا تو انھیں کالج کی سکرٹری شپ سے سبکدوش ہونا پڑیگا۔ کالج کی حالت اس وقت بہت نازک تھی، اس لئے مصلحت اس میں سمجھی کہ اُردو کی حمایت سے دست بردار ہو جائیں۔ تاہم اُن کی یہ کارروائی بے اثر نہ رہی۔

نواب محسن الملک اُسی شاہ راہ پر گامزن رہے جس کی داغ بیل سرسید ڈال

گئے تھے۔ سید کے بعد محسن الملک نے اُن کے کام کو جس طرح سنبھالا، نبھایا اور بڑھایا یہ انھیں کا کام تھا۔ اُن کے بعد کوئی اُن کی یادگار بنائے یا نہ بنائے، محسن الملک کا کام اُن کی سب سے بڑی یادگار رہے۔



تعلیق صفحہ ۱۶۶

شملہ ڈپوٹیشن

سیاسیاتِ ہند میں مسلمانوں کا سیاسی مطالبہ اس کے لئے ڈپوٹیشن کی ترتیب اڈریس کی تیاری اور پیشی نہایت اہم واقعہ ہے اس نے مسلمانوں میں سیاسی حقوق کا خیال پیدا کیا ان کے سیاسی جمود اور ان کی سیاسی مہر سکوت کو توڑا۔ اور ہندوستانی سیاسیات میں اُن کی ایک منظم جماعت بنادی لیکن اس واقعہ کا تمام تر تعلق نواب محسن الملک کی ذات سے ہے ان کے سوانح یا تذکرہ میں ضرورت تھی کہ اس واقعہ کو مناسب تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے۔ مؤلف نے اس کے مواد فراہم کرنے میں بہت کوشش کی مسٹر آرچبولڈ سے بھی مراسلت کی۔ لیکن ناکامی ہوئی مجبوراً اسی مواد پر جو اخبارات سے حاصل ہوا قناعت کرنی پڑی، اب اس نوبت پر کہ کتاب بالکل تیار ہو چکی تھی، عزیز مکرم مولوی حاجی محی الاسلام صاحب زبیری بی اے (علیگ) اکسائز انسپکٹر سے غیر متوقع طور پر چند گھنٹوں کے لئے ملاقات ہوگئی وہ ۱۹۰۵ء سے جنوری ۱۹۰۷ء تک نواب محسن الملک کے پرسنل اسسٹنٹ تھے اور اس ڈپوٹیشن کی تمام کارروائی ان ہی کے ہاتوں سے ہوئی تھی ان کے پاس بعض اہم یادداشتیں بھی تھیں جو ایک چوری کے سلسلہ میں تلف ہو گئیں مؤلف نے ان سے درخواست کی کہ اپنے حافظہ کی مدد سے ان واقعات کو لکھوا دیں اور اُنھوں نے مہربانی سے اس مختصر صحبت میں یہ واقعات بیان کئے جو مؤلف نے اُسی وقت قلمبند کر لئے اور چوں کہ ابھی موقع تھا کہ آخر کتاب میں یہ بیان شامل ہو سکے اس لئے بطور تعلیق پیش کیا جاتا ہے۔

امید ہے کہ ناظرین مؤلف کے شریک ہو کر حاجی صاحب موصوف کے شکر گزار ہوں گے

نواب محسن الملک کی عادت تھی کہ وہ صبح کو بستر پر ہی روزانہ اخبارات میں سے کوئی اچھا انگریزی اخبار مطالعہ کر لیتے اور پھر مختلف اوقات میں جتنے اخبار آتے

سب پر نظر ڈال لیتے وہ اگرچہ عملاً سیاسیات سے علیحدہ تھے لیکن دنیا کے سیاسی حالات اور خاص کر ہندوستان کے پولیٹیکل معاملات سے پوری طرح باخبر رہتے تھے۔

جولائی یا اگست سنہ ۱۹۰۶ء کا مہینہ تھا وہ بمقام بمبئی واٹسن ہوٹل میں مقیم تھے اُن کے کمرہ سے بالکل ملا ہوا ڈرائنگ روم تھا جس میں متعدد روزانہ اخبارات علی الصباح آجاتے تھے ان کا معمول تھا کہ آنکھ کھلتے ہی وہاں سے اخبار منگوا کر لیٹے لیٹے دیکھ لیتے۔ چنانچہ ایک صبح کو حسب معمول اخبار دیکھا جس میں لارڈ مارلے وزیر ہند کی بجٹ اسپیچ تھی، دیکھتے ہی مجھے طلب کیا، میں قریب کے دوسرے کمرہ میں تھا مجھے وہ مضمون پڑھنے کو دیا اور جوں ہی میں نے ختم کیا اُنہوں نے مسٹر آرچبولڈ کو ایک چٹھی لکھوانی شروع کی، وہ اُس وقت شملہ میں تعطیل کا زمانہ گذار رہے تھے چٹھی کا ماحصل یہ تھا کہ وہ کرنل ڈنلاپ اسمتھ (وائسرائے کے پرائیویٹ سکریٹری) سے فوراً ملیں اور اُن پر یہ ظاہر کریں کہ مسلمانان ہند ایک ڈپوٹیشن کے ذریعہ سے وائسرائے کے حضور میں اپنے سیاسی حقوق کے متعلق مطالبات پیش کرنا چاہتے ہیں، اور اس کا جلد جواب دیا جائے۔ اس چٹھی کو لکھواتے وقت معلوم ہوتا تھا کہ نواب صاحب کے دماغ میں ان ہی چند منٹوں کے اندر ایک مکمل اسکیم مرتب و تیار ہو گئی ہے۔

تیسرے روز صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب (مرحوم) کا ایک خط علی گڑھ سے موصول ہوا جس کا مضمون یہ تھا کہ فلاں تاریخ کے اخبار میں لارڈ مارلے کے اسپیچ متعلق ریفارم شائع ہوئی ہے اس کو غالباً آپ نے دیکھا ہوگا۔ اگر نہ دیکھا ہو تو اب دیکھ لیجئے اور مسلمانان ہند کو اس کے متعلق جد و جہد کرنی چاہئے اس خط میں کوئی اسکیم یا تجویز نہ تھی بلکہ وہ ایک قسم کا حکم نامہ تھا اس کو پڑھتے ہوئے صاف طور پر ان کے چہرہ سے ناگواری اور طبیعت کی کبیدگی معلوم ہوتی تھی۔

صاحبزادہ صاحب کی تحریروں میں عموماً ایسا ہی طرز ہوتا تھا اور ہمیشہ نواب صاحب

کو اُن سے تکلیف ہوتی تھی لیکن وہ اپنے تحمل و بردباری سے انگیز کرتے رہتے تھے البتہ کبھی کبھی مجھ پر یا خاص دوستوں پر ظاہر کر دیتے تھے چنانچہ اس وقت بھی وہ ضبط نہ کر سکے اور مجھ سے اس کا اظہار کیا۔

مسٹر آرچبولڈ کو خط لکھنے کے بعد تمام صوبوں کے مشاہیر کے نام خطوط لکھوائے اور ایک آل انڈیا ڈپوٹیشن کی تجویز پیش کی۔

مسٹر آرچبولڈ نے گفتگو کر کے فوراً جواب دیا جس سے یہ تو معلوم ہو گیا کہ دیسرائے ڈپوٹیشن منظور کرنے کو آمادہ ہیں اور مفصل خط کا انتظار رہا۔

اس دوران میں ہر جگہہ سے نواب صاحب کے خطوط کے تائیدی جوابات موصول ہو گئے۔

مسٹر آرچبولڈ نے (۱۰ راگست) کو مفصل خط بھیجا جو طبع کرا کے بصیغہ راز خاص خاص اصحاب کے پاس بھیجا گیا۔

ایڈرس لکھنے کے لئے نواب صاحب نے مولوی سید حسین بلگرامی (نواب عماد الملک) کو منتخب کر کے خط لکھا اور جب اُنہوں نے آمادگی ظاہر کی تو مجھے حکم دیا کہ کل مواد لے کر میں حیدرآباد فوراً روانہ ہو جاؤں اور ایڈرس لکھوا کر لاؤں، میں تیار ہو رہا تھا کہ نواب عماد الملک نے خود اپنے آنے کی اطلاع تار سے دی۔

چنانچہ وہ بمبئی تشریف لائے، نواب محسن الملک روزانہ صبح کو ان کے پاس اُن کی جائے قیام پر جاتے۔ باہمی تبادلہ خیالات ہوتا اور نواب عماد الملک مجھکو لکھواتے کسی دن ایک اور کسی دن دو فقرے لکھے جاتے، کافی ٹیر (کافی بنانے کا خاص چولھا) پاس رکھا رہتا، وہ خود اپنے ہاتھ سے کافی بناتے، پلاتے اور پیتے رہتے۔ نواب عماد الملک مرحوم کی عادت تھی کہ وہ ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریر یا ٹائپ کئے ہوئے مسودہ پر نہیں بلکہ چھپ جانے کے بعد مضمون پر نظر ثانی کرتے تھے۔ غرض کہ جو کچھ دو ڈھائی گھنٹہ میں لکھا جاتا

اس کو میں بمبئی گزٹ کے پریس میں طبع کرا کے شام تک ان کی خدمت میں حاضر کر دیتا پھر اس پر نظر ثانی کرتے لیکن بہت ہی کم دوبارہ اصلاح کی نوبت آتی، اس طرح تقریباً ایک ہفتہ میں ایڈریس مکمل ہوا۔

یہ زمانہ وہاں پریسوں کی بڑی مشغولیت کا تھا ٹائمز پریس نے دو صفحہ کی طباعت کے لئے پندرہ دن کی مہلت چاہی تھی اور کوئی پریس روزانہ اس کام کے کرنے پر آمادہ نہ تھا مگر بمبئی گزٹ کے منیجر مسٹر ٹمپلٹن جو کہ نواب محسن الملک کے بڑے دوست تھے راضی ہو گئے، ایڈریس کی تین سو کاپیاں تیار ہوئیں اور کانفیڈنشل طور پر ہر صوبہ کے مشاہیر کو بھیجی گئیں۔

یہ کام اگرچہ نہایت رازداری اور سخت احتیاط کے ساتھ ہو رہا تھا لیکن ہندو سیاسیین کو کسی طرح اس کا پتہ چل گیا اور انہوں نے اخبارات میں یہ اطلاع بھی شائع کر دی کہ مسلمان ایک ڈپوٹیشن لے جانا چاہتے ہیں اُن کے ایڈریس کا انتظار ہے، ساتھ ہی بعض لوگ اس کی ایک کاپی حاصل کرنے کے لئے کافی رقم صرف کرنے پر آمادہ تھے لیکن ایک کاپی بھی کہیں سے اُن کو نہ مل سکی، اس معاملہ کے متعلق جو صدہا تحریریں مشاہیر کے پاس بھیجی گئیں ان سے سب ہی نے لفظ بہ لفظ اتفاق کیا۔

البتہ ایک سخت دشواری یہ پیش آگئی تھی کہ مشرقی بنگال والے اور خصوصًا (نواب سر) خواجہ سلیم اللہ خاں اور (سر) نواب علی چودھری کی زبردست خواہش تھی کہ ایڈریس میں تقسیم بنگال کے متعلق ضرور تذکرہ ہونا چاہئے اور اس امر کی خواہش کا اظہار ضروری ہے کہ گورنمنٹ اس تقسیم پر قائم رہے اگر یہ خواہش منظور نہ کی گئی تو ڈپوٹیشن میں مشرقی بنگالہ کی نمائندگی نہ ہوگی، اُدھر پنجاب سے (سر) محمد شفیع اور (مسٹر جسٹس) شاہ دین نے اس امر پر اصرار کیا تھا کہ کوئی اختلافی مسئلہ ایڈریس میں شامل نہ کیا جائے اور اگر شامل کیا گیا تو پنجاب سے کوئی ممبر شریک نہ ہوگا۔ نواب محسن الملک نے ابتدا میں ہی

نواب عماد الملک پر یہ ظاہر کر دیا تھا کہ کوئی ایسا مسئلہ جس پر ہندؤوں کو اختلاف کا موقع ہو ایڈریس میں نہ آنا چاہیئے اور کوئی حملہ کسی فرقہ پر نہ ہو۔ ہمارا ایڈریس صرف اپنے مطالبات حقوق تک محدود رہے، لیکن چوں کہ دو صوبوں کے درمیان یہ شدید بحث پیدا ہو گئی تھی اس لئے وہ کچھ متردد ہوئے مگر اُنہوں نے اس کا حل بھی فوراً سوچ لیا۔ اور لکھنؤ میں ایڈریس پر غور و بحث کرنے کے لئے ایک جلسۂ شوریٰ کے انعقاد کی تجویز کر لی۔

یہ اُن کی خاص صفت تھی کہ مشکل سامنے آتے ہی فوراً اس کا حل بھی سامنے آ جاتا تھا۔ چنانچہ لکھنؤ میں جب یہ جلسہ زیر صدارت مسٹر عبدالرحیم صاحب (حالی سر عبدالرحیم صدر لیجسلیٹو اسمبلی) منعقد ہوا تو طے ہو گیا کہ تقسیم بنگالہ کا تذکرہ مناسب نہیں اور یہ اس خوبصورتی سے طے ہوا کہ مشرقی بنگالہ کے نمایندے مطمئن اور راضی ہو گئے۔

اب ایک سوال ڈپوٹیشن کے ممبروں کا انتخاب اور دوسرا ڈپوٹیشن کی قیادت کا سامنے تھا۔ قیادت کے لئے ہر صوبہ سے کئی کئی اصحاب امیدوار تھے اور اسی طرح کئی ڈپوٹیشن کی ممبری کے لئے بھی، نواب محسن الملک نے ممبری کے مسئلہ کو اپنی ذاتی رائے اور تجربہ سے لوگوں کو منتخب کر کے ختم کر دیا اور اتنے اہم معاملہ میں کسی شخص نے کوئی عذر یا احتجاج نہیں کیا۔ قیادت کا معاملہ اس سے زیادہ نازک تھا مسلمان فرماں روایان ہند میں کسی کا انتخاب ممکن نہ تھا ان کے بعد ہز ہائینس سر آغا خاں کی ہی ایک ایسی شخصیت تھی جس پر کسی کو اعتراض نہ ہوتا لیکن وہ ہندوستان میں موجود نہ تھے اور گو اُن کی واپسی کی خبر تھی مگر وقت سے اطلاع نہ تھی اور ڈپوٹیشن کی پیشی کو بہت تھوڑا عرصہ باقی رہ گیا تھا، جہاں تک میں نے قیاس کیا اُنہوں نے یہ تجویز کر لیا تھا کہ نواب عماد الملک کو ممبر کر کے ڈپوٹیشن کی قیادت کے لئے مناسب وقت پر منتخب کرا لیا جائے گا اور یہ یقین تھا کہ ان پر سب متفق ہو جائیں گے لیکن ہز ہائینس نظام نے ان کو ممبر ہونے کی اجازت نہ دی۔ یہ تردد ہی تھا کہ لکھنؤ میں مولوی (سر) رفیع الدین بارایٹ لا کا تار بمبئی سے موصول ہوا کہ

ہز ہائینس براہ کولمبو چین تشریف لئے جا رہے ہیں اور کولمبو میں اُن کا جہاز چند روز ٹھیر گیا اسی وقت باوجودیکہ اس محنت سے نواب صاحب کا دس پونڈ وزن گھٹ گیا تھا اور صحت پر سخت اثر تھا۔ موسم بھی تکلیف دہ تھا لیکن وہ فوراً بمبئی روانہ ہو گئے اور وہاں مولوی رفیع الدین کے مشورہ سے ہز ہائینس کو ایک مفصل تار روانہ کیا اور ان سے درخواست کی۔ کہ وہ فوراً ہندوستان آکر اس ڈیپوٹیشن کی قیادت کریں، ساتھ ہی ایڈریس کی ایک کاپی اور ضروری اطلاعات بذریعہ ڈاک روانہ کی گئیں۔

ہز ہائینس نے فوراً منظوری کی اطلاع دی اور اُن کے آنے سے تین چار دن پہلے ڈیپوٹیشن کے ممبر شملہ میں جمع ہو گئے ہز ہائینس جہاز سے اُتر کر براہ راست شملہ روانہ ہوئے اور درمیانی سٹیشنوں سے ایڈریس کے متعلق بذریعہ تار اپنے مشورے بھیجتے رہے، معلوم ہوتا ہے کہ اسی سفر کے دوران میں اُنہوں نے ایڈریس پر غور کرنا شروع کیا تھا ان مشوروں میں اہم مشورہ یہ تھا کہ ایڈریس میں مسلم یونیورسٹی کا مطالبہ اضافہ کیا جائے چنانچہ پھر شملہ میں ایک میٹنگ ہوئی اور غور کے بعد یہ مطالبہ شامل کیا گیا۔ حالاں کہ ہز اکسیلنسی کے پاس ایڈریس کی کاپی جا چکی تھی۔

ہز ہائینس ڈیپوٹیشن کی باریابی سے ایک دن پہلے شملہ پہونچے اور اسی دن شام کو میں نے اپنے قلم سے آخری کاپی تیار کی جو پرائیویٹ سکرٹری کے پاس بھیجی گئی۔

چوں کہ کرنل ڈنلاپ اسمتھ پر نواب محسن الملک کا خاص اثر تھا اور وہ نواب صاحب کا بڑا احترام کرتے تھے اس لئے ان معاملات میں بڑی آسانیاں حاصل ہو گئی تھیں جو دوسری صورت میں ممکن نہ تھیں۔

اُس زمانہ کی اور نیز آج کل کی بھی ذہنیت کے لحاظ سے یہ واقعہ قابل بیان ہے کہ نواب محسن الملک نے ایڈریس پیش ہونے سے قبل کرنل ڈنلاپ اسمتھ سے کہا کہ ایڈریس کی پیشی اور جواب تو ایک ضابطہ کی تکمیل ہو گی ضرورت یہ ہے کہ ڈیپوٹیشن کے ممبروں کو

فرداً فرداً ہز ایکسیلنسی سے ملاقات اور تبادلہ خیال کا موقع دیا جائے۔

کرنل نے جواب دیا کہ یہ ناممکن ہے کیوں کہ ویسرائے کے پروگرام میں قطعی گنجائش نہیں، یکم کو ڈپوٹیشن پیش ہوگا اور ۳ کو ویسرائے شملہ سے روانہ ہو جائیں گے، تبادلہ خیالات کے متعلق تو صرف آپ ہی خاص شخص ہیں اس لئے آپ کی ملاقات کا انتظام کسی نہ کسی طرح میں کر دوں گا اور آپ ہی ڈپوٹیشن کے سکرٹری اور بانی بھی ہیں۔

نواب محسن الملک نے جواب دیا کہ میں بھی اور ممبروں کی طرح ایک ممبر ہوں، میں نہ اس کا بانی ہوں اور نہ سکرٹری، یہاں یہ خیال رکھنا چاہئے کہ انہوں نے کہیں بھی ضابطہ سے اپنا نام سکرٹری اور بانی کی حیثیت سے ظاہر نہیں کیا اور نہ اپنے لئے دیگر ممبران سے کوئی امتیاز رکھا۔ اس گفتگو میں نواب صاحب نے یہ بھی کہا کہ اگر میری ملاقات کا انتظام ہوا تو دوسروں کو شکایت کا موقع ملے گا۔ جب کرنل ڈنلاپ سمتھ نے ممبروں کی ملاقات کے انتظام سے معذوری ظاہر کی تو نواب صاحب نے مشورہ دیا کہ اگر اس عرصہ میں ویسرائیگل لاج میں کوئی پارٹی وغیرہ ہو تو اس میں سب کو مدعو کر لیا جائے۔ کرنل کو یہ تجویز بہت پسند آئی اور اگرچہ نہ پروگرام میں گنجائش تھی اور نہ کوئی پارٹی وغیرہ ہی ہونے والی تھی لیکن انہوں نے نواب صاحب کا شکریہ ادا کر کے یکم اکتوبر کو ہی پارٹی کا انتظام کرا دیا اور اس طرح ہر ممبر کو ایک ہی حیثیت سے ویسرائے اور کمانڈر انچیف سے ملاقات کا موقع مل گیا۔

یہ ڈپوٹیشن اور یہ ایڈریس اور جواب اور پارٹی تو رسمی باتیں تھیں ان سے فارغ ہو کر یکے بعد دیگرے دو ہی دن میں تمام ممبر روانہ ہو گئے لیکن نواب محسن الملک وہیں ٹھہر گئے اور ان تمام ممبروں میں سے سر علی امام کو بھی روک لیا اور ان کو ساتھ لے کر دوسرے دن سے اگزیکٹو کونسل کے ممبروں سکرٹریوں اور دوسرے عہدہ داروں سے ملاقاتیں کیں اور اپنے حقوق و مطالبات کی اہمیت سب کے ذہن نشین کی۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصہ کے

بعد بنگال میں شرف الدین پنجاب میں شاہ دین اور یو۔پی میں کرامت حسین ہائیکورٹ کی کرسی پر نظر آگئے اور پھر عرصہ تک جو اصحاب کہ ممتاز عہدوں پر مامور ہوئے ان میں اسی ڈپوٹیشن کے ممبروں کا زیادہ حصہ تھا۔

نواب محسن الملک نے اینگلو انڈین اخبارات کی تائید بھی حاصل کی اور مسٹر گریسی[۵] سے جو متعدد اخبارات کے زبردست مضمون نگار تھے۔ اس موضوع پر خاص مضامین لکھوائے۔

اسی زمانہ میں جب کہ ایڈریس وغیرہ کی تیاری ہو رہی تھی "ٹائمز آف انڈیا" کا نیا ایڈیٹر مسٹر لورٹ فریزر Lovat Fraser مقرر ہو کر انگلستان سے آئے تھے، نواب صاحب نے ان سے وقت مقرر کرکے ملاقات کی تاکہ وہ اس اخبار کی ہمدردی حاصل کریں۔ چنانچہ وہ مجھے ساتھ لیکر ملنے گئے۔ مسٹر لورٹ نے چند سوالات پہلے سے ہی تیار کر لئے تھے، ملاقات ہوتے ہی اس نے ان کو شروع کیا۔ سوال سمجھنے میں تو نواب صاحب کو کوئی دقت ہی نہ تھی وہ بلا تکلف جواب کو اردو میں مجھسے کہتے اور میں انگریزی میں ترجمہ کر دیتا ان سوالات میں ایک سوال یہ بھی تھا کہ "اگر برٹش حکومت اور ٹرکی میں جنگ ہو تو مسلمانانِ ہند کس کا ساتھ دیں گے" اب آپ موقع اور حالات کی نزاکت کا تصور کیجئے اور پھر دیکھئے کہ اس کا جواب اور وہ بھی برجستہ یہ تھا کہ ہاتھ برٹش حکومت کے ساتھ اور دل ٹرکی حکومت کے ساتھ ہونگے۔

میں نے نواب صاحب کے پاس دو سال تک ہر وقت حاضر رہ کر کام کیا اور ہر موقع پر دیکھا کہ وہ نہایت شفیق مہربان جوہر شناس اور ہر مشکل کو حل کرنے کے لئے آمادہ ہیں سیاسی مطالبات کا خیال اور اس ڈپوٹیشن کی ترتیب ہی ان کی شخصیت کے مرتبۂ عظیم کو نمایاں کر رہی ہے۔



---

[۵] یہ ایک ریٹائرڈ جج تھے اور حیدرآبادی معاملات میں اکثر زورِ قلم سے اثر ڈالا کرتے تھے۔

الف

ضمیمہ

محسن الملک میموریل کی تجاویز اور اُن کا نتیجہ

(ا)

نواب محسن الملک کی تدفین کے بعد ہی شام کو مقامی اصحاب کا ایک جلسہ ماتمی منعقد ہوا جس میں یادگار قائم کئے جانے کے متعلق پُرجوش تقریریں ہوئیں اور طے پایا کہ "یادگار کی شکل ایسی ہونی چاہئے کہ اس سے ایک طرف یونیورسٹی کا مقصد حاصل ہو دوسری طرف کالج کی کوئی اہم ضرورت پوری ہوتی ہو نیز اس سے کالج کو کوئی مالی فائدہ پہنچے" چنانچہ ایک وسیع پختہ بورڈنگ ہاؤس بنانا تجویز ہوا جس کی آمدنی سے کالج میں پروفیسر شپ قائم ہوں، ایک لاکھ روپیہ سرمایہ عمارت قرار دیا گیا اور میموریل فنڈ کمیٹی قائم ہوگئی پھر ۲۷ اکتوبر کو کمیٹی نے تین لاکھ روپیہ سرمایہ قرار دیا اضلاع میں کمیٹیوں کا قیام اور بڑے بڑے مقامات میں وفود کا بھیجا جانا طے ہوا انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں یادگار کی شان اور ضرورت پر توجہ دلاتے ہوئے تنبیہ کی گئی کہ "اگر نوحہ خوانی پر بس کی گئی اور مرحوم کی قومی خدمات کی احسان مندی کا عملی ثبوت نہ دیا گیا اور اُن کی مفید یادگار قائم کرنے میں غفلت یا تاخیر کی گئی تو اس میں ذرا شک نہیں ہے کہ موجودہ نسل پر آنے والی نسل ملامت کرے گی اور اس زمانہ کے مسلمانوں کی ناقدری اور محسن فراموشی ہمیشہ یادگار رہے گی"۔ گزشتہ ۱۹۰۶ء میں حالت قحط رونما ہوگئی اس بنا پر "تجربہ کار[۱] ہمدردانِ قوم نے یہ فیصلہ کیا کہ اگر اس وقت میں چندہ کھولا جاوے گا تو نتیجہ یہ ہوگا کہ جہاں سے ایک ہزار کی توقع ہوسکتی ہے وہاں سے سو روپیہ کی

---

[۱] مکاتیب حصہ دوم صفحہ ۱۲۰-

رقم کا ملنا بھی مشکل ہو گا اور یہ ایک بڑا نقصان اس لئے برداشت کرنا پڑے گا کہ ہم نے مناسب وقت کا خیال نہ کرکے عجلت سے کام شروع کیا"۔

لیکن وقت مناسب آتے ہی دسمبر ۱۹۰۸ء میں بہ اجلاس کانفرنس منعقدہ امرتسر تحریک چندہ پیش ہوئی بہت سے وعدے حاصل ہوئے اور پھر ۲۲ فروری ۱۹۰۹ء کو ہز آنر سر جان پرسکاٹ ہیوٹ لفٹننٹ گورنر کی صدارت میں میموریل فنڈ کا افتتاح ہوا۔

(۲)

۲۴ نومبر کو ہز ہائینس سر آغا خاں نے نواب وقار الملک کو یونیورسٹی کی مرکزی تحریک کے آغاز کرنے پر توجہ دلائی اور اس امر پر زور دیا کہ جداگانہ تحریکیں اسی کے دائرہ میں شامل ہو جائیں، چنانچہ یہ تحریک بڑے زور شور کے ساتھ اٹھائی گئی اور چونکہ محسن الملک میموریل میں بھی یونیورسٹی کا مقصد اور کالج کی اہم ضرورتوں کی تکمیل شامل تھی اس لئے محسن الملک میموریل فنڈ ۱۱-۱۹۱۰ء کے مالی سال پر ختم ہو گیا جس کی رقم وصول شدہ ۳۱،۰۵۱ روپیہ تھی۔

(۳)

مسلمانان ہند کے اس مرکزی ادارہ کی تاریخ میں یادگاروں کا باب نہایت دلچسپ ہے، اس کی عمارات کی پیشانیوں پر اس کے برآمدوں اور کمروں میں اتنے کتبات یادگار نظر آتے ہیں کہ شاید ہی کسی دوسرے ادارہ میں نظر آئیں لیکن جہاں یہ یادگاریں فیاضی و شکرگزاری کے آثار ہیں وہاں بعض کی حقیقتیں نہایت حسرتناک اور افسوسناک بھی ہیں۔

یہ پورا بیان یہ کامل اظہار حقیقت اُس شخص کا کام ہو گا جو تحقیق اور غور کے بعد آزادی و صداقت سے مسلم یونیورسٹی کی تاریخ مرتب کرے گا۔

البتہ اگر کوئی شخص اس ضمیمہ کو دیکھنے کی زحمت گوارا نہ کرے تو یہی خیال کرے گا کہ قوم کی جو اعلیٰ اور قیمتی خدمات محسن الملک نے انجام دیں اور ان کے اعتراف میں جو جوش و جذبہ

ظاہر کیا گیا اس سب کے لحاظ سے مسلم یونیورسٹی کی سرزمین پر ایک عظیم الشان یادگار قائم کی گئی ہوگی جس سے بعد کی نسلوں میں قومی خدمت کے عزائم پیدا ہوتے رہیں گے اور صاحب یادگار کا نام شکر گزاری و احسان مندی کے جذبات کے ساتھ قائم ہوگا لیکن اس ادارہ میں ناسپاسی کی وہ شرمناک مثال پیش کی گئی جو کسی قوم میں نظر نہ آئے گی۔

(۴)

پہلی یادگار۔ ایک عرصہ کے بعد مئی سنہ ۱۹۱۳ء میں (سر) محمد یعقوب (علیگ) و رئیس مراد آباد نے یادگار قائم کئے جانے کے متعلق آنریری سکریٹری کو ایک خط کے ذریعہ سے توجہ دلائی ۲۹ جون کو سنڈیکیٹ[۱] نے یہ رزولیوشن پاس کیا کہ "منٹو سرکل میں ایک بورڈنگ ہاؤس جو کسی کے نام پر نہیں بنایا گیا ہے وہ نواب محسن الملک بہادر مرحوم کے نام سے موسوم کیا جائے۔" لیکن رزولیوشن پاس ہونے سے پہلے ہی منٹو سرکل کے چاروں بورڈنگ ہاؤس اپنے بانیوں اور دیگر اصحاب کے نام سے موسوم ہو چکے تھے۔

دوسری یادگار۔ پھر جولائی سنہ ۱۹۱۴ء کی بجٹ میٹنگ میں یہ امر قرار پایا کہ "صاحب باغ[۲] کو محسن الملک لاہوسٹل کے نام سے موسوم کیا جانا منظور کیا جائے اور اس کی خرید و تعمیر پر جو صرف ہوا ہے وہ محسن الملک میموریل فنڈ سے ادا کیا جائے اور باقی اس کی تزئین میں صرف ہوگا۔"

اس منظوری پر بارہ سال گزرنے پر جون سنہ ۱۹۲۶ء میں یونیورسٹی کی اگزکٹو کونسل نے

---

[۱] سنہ ۱۹۰۹ء میں ایم اے او کالج کے کاموں میں آنریری سکرٹری کی امداد کے لئے سنڈیکیٹ کا قیام عمل میں آیا تھا اور مختلف شعبے مختلف ٹرسٹیوں کو تفویض کئے گئے جو سنڈیکیٹ کے ممبر منتخب ہوئے تھے اور ان کے معاملات سنڈیکیٹ کے اجلاس میں پیش ہوتے تھے۔

[۲] یہ قدیم وضع کی کوٹھی علی گڑھ میں سیندھیا کے آثار حکومت کے طور پر باقی ہے چوں کہ اس میں سیندھیا کا فوجی گورنر (جنرل پیرن) رہتا تھا اس لئے صاحب باغ کے نام سے زبان زد خلائق ہے۔

اس کی تجدید کی کہ "صاحب باغ کو محسن الملک ہوسٹل سے موسوم کیا جائے"، مگر فوراً یہ عمارت طبیہ کالج کے دفتر مطب اور دواخانہ کے لئے مخصوص کر دی گئی۔

تیسری یادگار: ۱۹۲۸ء میں جب یونیورسٹی کے بورڈنگ ہاؤس کو ہالس[51] میں بنا کر تقسیم کیا گیا تو اُس وقت ایک ہال سرسید کے نام سے موسوم تھا جدید ہال کو محسن الملک کے نام سے موسوم کیا گیا اور اس طرح سالہا سال کے بعد یہ نام کاغذات میں درج اور زبانوں پر جاری ہوا۔

چوتھی یادگار: ۱۹۳۰ء میں جب صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب کا انتقال ہوا تو اولڈ بوائز نے اپنی برادری کے چندوں سے مرحوم کی یادگار میں ایک ہوسٹل بنانا تجویز کیا اور وہ ۱۹۳۲ء میں تعمیر[52] ہو گیا۔ پُر جوش مستعد اصحاب نے یونیورسٹی کی اگزکٹو کونسل سے ایک آفتاب ہال اور اُس کی کونسل قائم کئے جانے کی منظوری[53] حاصل کر لی اور آغاز ۱۹۳۴ء میں یہ طے کرا لیا کہ "ایک جدید نان رزیڈنس ہال قائم کر کے محسن الملک کے نام سے موسوم کیا جائے اور اُس کے بورڈنگ ہاؤس آفتاب ہال کو دیدیے جائیں"

پانچویں یادگار: چوں کہ قانوناً نان رزیڈنس ہال قائم نہیں ہو سکتا تھا اس لئے ۲۷ اپریل ۱۹۳۴ء کو اکاڈیمک کونسل نے تحریک کی کہ محسن الملک ہال بدستور قائم رکھا جائے اور اُس کا انتظام آفتاب ہال کونسل کرے لیکن اس ہال کونسل نے میمورینڈم کے ذریعہ

---

[51] تیسرا ہال ۱۹۳۳ء میں وقار الملک کے نام سے منسوب ہوا۔

[52] یہ عمارت یونیورسٹی کی نہایت شاندار عمارت ہے جس پر تقریباً سوا لاکھ روپیہ لاگت آئی ہے مگر اس کا بڑا حصہ سودی قرض اور اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے سرمایہ کی فروخت اور رواں آمدنی سے ادا کیا گیا ہے۔

[53] یہ منظوری جس طریق اور جن ترکیبوں سے حاصل کی گئی اور ترقی یافتہ حضرات نے جو راہ عمل اختیار کی اُس کو اخبار سرگزشت کی اشاعت ۲۴ اکتوبر ۱۹۳۴ء میں دیکھنا چاہیے۔

۵

سے محسن الملک کے نام سے قطعی انکار کر دیا۔ اس بنا پر اگزکٹو کونسل نے طے کیا کہ "محسن الملک کی خدمات کے لحاظ سے سب سے اعلیٰ اور بہترین عمارت ان کے نام سے منسوب کی جائے اور سائنس لیباریٹریز جو آٹھ لاکھ روپیہ سے تعمیر ہوئی ہیں اُن کو محسن الملک لیباریٹریز کہا جائے"

یادگار دوئیں پر بازگشت

مگر فوراً ہی اگزکٹو کونسل کے علم میں یہ بات لائی گئی کہ یہ لیباریٹریز یعنی سائنس کالج درحقیقت اس پرنس آف ویلز سائنس اسکول کی ترقی یافتہ شکل ہے جو موجودہ ملک معظم قیصر ہند کی کالج وزٹ ۱۹۰۶ء کی یادگار میں قائم ہوا تھا تو پھر ۲۸ جولائی ۱۹۳۴ء کو محسن الملک کے نام کا بورڈ صاحب باغ کے ہی دروازہ پر لگایا جانا تجویز ہو گیا۔

(۶)

یونین کلب میں محسن الملک کی تصویر

کسی زمانہ میں طلبا نے یونین کلب میں ڈائس پر سر سید کی تصویر کے برابر نواب محسن الملک کی تصویر آویزاں کی تھی لیکن ۱۹۳۳ء میں وہ جگہ عصر جدید کے قائد اعظم مولانا محمد علی مرحوم کی تصویر کے لئے موزوں مقصود ہوئی اور اس کو آویزاں کر کے نیچے ایک کتبہ نصب کر دیا گیا اس کارروائی پر جب اخبار سرگزشت نے توجہ دلائی تو پھر دوسری جگہ وہ اُتار پھینکی ہوئی تصویر آویزاں کی گئی۔

(۷)

محسن الملک کا مقبرہ

ہر مسلمان کی آرزو ہوتی ہے کہ اگر ارض حرمین الشریفین یا کسی مقدس بزرگ کا جوار و پائیں نصیب نہ ہو تو اپنے خاندانی قبرستان میں دفن کیا جائے اور اُس کے ورثا حتی الامکان اس آرزو کو پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن محسن الملک کو بہ ایں

ادعا کہ "ان کا وجود محض ایک شخصی وجود نہیں ہے بلکہ ایک قومی وجود ہے" اور بہ ایں بنیاد کہ سرسید کے پہلو میں دفن کئے جانے کا حق ان سے بڑھ کر اور کس کو ہو سکتا ہے "مسجد کے قبرستان میں دفن کیا گیا مگر" یہ قبر مولوی سید[1] زین العابدین کے پہلو میں بنی ہوئی ہے اور یہ مقبرہ یوں کہ بطور خود علیحدہ ہے لہذا یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شخص مولوی زین العابدین کی ذریات سے مدفون ہے یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ جس شخص کی یہ قبر ہے اُس کا درجہ مولوی زین العابدین خاں سے کم ہے اس اعتبار سے گویا نواب محسن الملک کی شان کم ہوتی ہے ان کی قومی خدمات دھندلی ہو جانے کا اندیشہ ہے ان کے عظیم الشان قومی کاموں کی حیثیت گویا مولوی زین العابدین سے کم نظر آئے گی"

اسی فاصلہ کی وجہ سے جب ۱۹۱۵ء میں مقبرہ کا ایک چھوٹا سا دروازہ بنایا گیا تو اُس کو قبر کے پاس سے ہٹا کر بنانا پڑا جو ہندوستان میں تو اس قسم کی تعمیر کا ایک ہی نمونہ ہے۔

کوئی شخص بجز ان اصحاب کے جنھوں نے یہ جگہہ تجویز کی اور جن کے ہاتوں میں اس وقت شعبۂ تعمیر اور کالج کا نظم و نسق تھا نہیں سمجھ سکتا کہ اُس قومی وجود کو با وجود سرسید کے پہلو میں کافی جگہہ ہونے کے کیوں اتنے فاصلہ پر دفن کیا گیا۔

(۸)

یہ مادی یادگاریں زمانہ کی گردش سے پس کر معدوم ہو جاتی ہیں سر بفلک ایوان و قصور اور عالی شان مقابر ذرات بن کر فضا میں مل جاتے ہیں لیکن اس فانی دنیا میں تاریخ کی عمر پھر بھی بہت زیادہ ہوتی ہے اور وہ اپنی زندگی بھر زمانہ کے ناموروں علم و ہنر کے مربیوں قوم کے عاشقوں اور ملک کے خادموں کو زندہ اور قائم و دائم رکھتی ہے۔ اُن کے لیے ایسی مادی یادگاریں کوئی شرف نہیں ہوتیں۔

---

[1] یہ فقرات خان بہادر مولوی بشیر الدین صاحب اڈیٹر البشیر اٹاوہ نے اسی زمانہ میں لکھے تھے۔

ز

محسن الملک - ہمیشہ محسن الملک رہے گا - اُس کی زندگی سبق آموز رہے گی، وہ خلوص و ایثار اور خدائیت کی تعلیم دے گی، اُس کا پیارا نام اور شاندار کام قومی ارتقا کی تاریخ میں سورج کی طرح چمکتا رہے گا -

محسن الملک خدا دے تجھے خدمت کی جزا
شافع روزِ جزا تیری وفا کوشی ہے

قوم کی دھن میں جوانی سے بڑھاپا کاٹا
آج سب جھگڑوں سے فرصت ہے سُبکدوشی ہے

تیرے احسان تری یاد بھلا نا دل سے
خونِ انصاف ہے احسان فراموشی ہے

تجھ کو ان باتوں سے کیا اب تو ہے عالم تِرا اَور
اک نئی شان تجلی سے ہم آغوشی ہے

آزاد بہاری

وَمَنْ يُّسْلِمْ وَجْهَهٗۤ اِلَى اللّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ؕ وَاِلَى اللّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ۝

distant from each other as Rangoon and Bombay. There could be no fitter memorial to him than a Fund for the further development of your College and its buildings. It will serve to remind coming generations of the man whose energy and inspiration came to the rescue of your college in an emergency when no one not endowed as he was could have succeeded in ensuring to it the aid which he enlisted. It is more than 18 months since the Nawab passed away and, in ordinary circumstances, I should have hoped to be present here to assist in starting this fund long before this; but, as you know, the famine intervened and claimed for the time that all charity should be directed to helping the afflicted. The famine has indeed passed away, but its mark is still all too plain on the state of the finances of the Government. It is not in my power at the present moment to give from the provincial revenues a donation towards the fund, nor can I even state what sum will be contributed when prospects improve. All that I can promise is that the fund shall be helped by the Local Government when the financial outlook is better. I am charged by the Viceroy to express to you his sympathy with the work you have in hand, towards which His Excellency will make a contribution. And I on my part shall have much pleasure in doing the same. To an audience such as that assembled here today it is not necessary for me to plead for help towards the better education of the Mohammadan community. There is no better object on which to spend your wealth and I invite you to set to work with all diligence to collect as large a fund as possible in honour of the memory of Nawab Mohsin-ul-Mulk who served your College so well.

[P. 288.]

ul-Mulk. It will be in your recollection that it was at rather a troublous period in the history of the College just ten years ago that he became its secretary. The College was then, owing to unfortunate circumstances which I need not mention now, rather seriously in debt. I need not remind this audience of the esteem in which the late Nawab Mohsin-ul-Mulk was held, and you are aware that, had his life not been suddenly cut off, he would have received from the Government a special recognition of his work among you. I personally met him first at the College just 30 years ago, but, to my regret, had no opportunity of seeing him again till 28 years afterwards when I was thrown together with him in connection with the trouble which then occurred among your students. During the few remaining months of his life I had several conversations with him regarding the affairs of the College, the welfare of which was the first thought of his life. The body had become frail but the sprit was still keen and eager and his enthusiasm was as unbounded as in his younger days. His great services to the College lay in the use that he made on its behalf of his inspiring eloquence. He was endowed with great gifts as a speaker and he employed those gifts without stint to promote its welfare. He had at one time to contend with misapprehensions regarding the aims and tendencies of the College, at another to call in the gentle art of persuasion wherewith to draw large numbers, who had previously been indifferent or hostile, to look towards it as the chief means of regenerating the Mohammadan community. If the conception of a central Mohammadan educational institution and its foundation on a secure basis during his lifetime was the work of Sir Syed Ahmad, the credit of popularizing the idea in all parts of India is due to Nawab Mohsin-ul-Mulk, whose peculiar gifts fitted him more than any one else for this task. The energy which led him, at an advanced age, to tour over India in the quest of aid to the College excited our admiration, and he succeeded in arousing public interest, shown in the best of ways by the large subscriptions given to it, in places so widely

of His Majesty's Indian Mussulman subjects. During the time I was in India I clearly saw what were the causes which placed them at a disadvantage in comparison with their Hindoo fellow subjects, and I became convinced that it was of the greatest importance to the general welfare of the Indian Empire that every encouragement compatible with principles of impartiality upon which our administration is founded, should be extended to them to overcome the difficulties with which they have had to contend. It is indeed evident that the whole body politic suffers from so important, vigorous, and energetic a section of the community being precluded from contributing their share to the general progress and moral expansion of the nation. But the misfortune is that the government can do very little. The real remedy for the disadvantageous position of the Mohamedans of India lies in their own hands. While the little Hindoo boy is learning his arithmetic and his English, the poor little Mohammedan is getting by heart interminable chapters of the Koran, and consequently finds himself irretrievably behind-hand. I do not think there is any other religion in the world where the actual knowing by rote of its sacred books is an indispensable necessity. Might it not be possible to introduce some relaxations into these rigid requirements, for it by no means follows that because a boy has had pages of a book crammed into his memory, he either understands it or appreciates its spirit? In any event, Education is the one great instrument by which in these days the doors of the world are opened to all men.

[P. 270] Yours sincerely,
(Sd). Dufferin & Ava.

---

(23)

Extract from the speech of His Honour Sir John Prescott Hewett.

In your address you refer to the loss sustained by the Trustees owing to the death of the late Nawab Mohsin-

(21)

LIEUTENANT GOVERNOR'S CAMP,
Punjab, 20th October, 1907.

Dear Mr. Archbold

I know nobody at Aligarh but yourself, to whom I can address this letter. Perhaps you will kindly pass it on to the Body of Trustees.

I wish to tell them how greatly I am grieved at the sudden death of Nawab Mohsin-ul-Mulk. The news, which has only just reached me in camp, has come upon me as a most unexpected shock; as it is only a fortnight ago that he called upon me, and we had a long conversation and instructive as usual. He certainly then seemed hale and hearty.

His death is a loss, alike to the College in the management of which he took so prominent a part, to the Mohammadan community whose interests always held the first place in his heart, and to the Government to which he was ever loyal. I feel entitled to say this, because my province has the second loyal Mohammedan population in India, because I regard the Aligarh College as far more than a merely provincial institution, and because the late Nawab was a personal friend of my own, whose counsels I valued and profited by.

I am,
very sincerely,
(Sd). W. IBBOTSON.

(P. 260.)

---

(22)

Private & Confidential.

BRITISH EMBASSEY,
Rome, Feb. 10th 1889.

My dear Mohsin-ul Mulk,

I need not say, that I was very much gratified by the receipt of your letter of the 14th of January; and of this you may be sure, that I shall never cease to take the deepest interest not only in all that concerns His Highness the Nizam and the state of Hyderabad, but in the welfare

Colonel Dunlop-Smith now writes to me to say that H. E. the Viceroy has decided to receive the Deputation of Mohamedans, if it is offered; and he asks me to say that a formal application must be sent in. He adds that a copy of the address which is to be presented must be sent to him, in the usual way, some time before the date of the reception of the Deputation—at least, ten days, if possible. Also, that as H. E. the Viceroy goes to Kashmir early in October, the Deputation should come before the end of September.

[P. 167.]

---

(20)

Private & Confidental.

**Lieutenant-Governor
Punjab.**

CAMP,
Punjab, 31.3.7.

Dear Nawab Saheb,

I must write to tell you how very sorry I am that you have felt compelled to resign the Secretaryship of the Aligarh College. I am afraid that this indicates the triumph of views less wise and sober than your own, and augurs ill for the future of an institution which, uptill the other day, I regarded as the best of its kind in India, and one of which the whole Mohammaden community might be proud.

Only yesterday, the Mazari Nawab, the head of the Baluches told me that he had sent his nephew to Aligarh, "because there they learn good manners and respect their elders and the authorities and to be moderate and to know their place."

Will this be true of Aligarh 10 years—or 5 years—hence? I hope so, but doubt.

[P. 242]

I am,
Yours sincerely,
(Sd.) IBBOTSON.

of many it has grown out of the internal arrangement of the Christian church. As it is capable of yielding such great benefits I desire its extension. I have not heard that the combination of Mohamaden with Christian Bulgarians has *persaltum* into countries where the condition of its application would be novel and therefore quite uncertain. Long consideration and tentative effort seem best adapted for such cases. While leaving the question itself thus open, I should be strongly predisposed against forcibly suppressing any opinions in regard to it which might be expressed in a loyal and peaceful manner.

I remain,
Dear Sir, with great respect,
Faithfully yours,
(Sd.) W. E. GLADSTONE.
To Mehdi Ali, Hyderabad.

(P. 160)

---

(19)

Strictly Confidential

Extracts from the letter of Mr. Archbold.

The 10th of August, 1906.

* * * * * *

My dear NAWAB SAHIB,

I can now write definitely as to the Mohamedan attitude in the present situation.

As I told you in my previous letter I explained the position to Colonel Dunlop-Smith, emphasising what I had to say in a subsequent letter. I assured him that I was certain that any address that suggested Deputation might present would contain nothing that was in any way disloyal, and that I was also certain that the Mohamedans had no wish whatever to do anything that would cause difficulty to the Government. At the same time, I explained the fears—reasonable fears—of the Mohamedans at the present time to the best of my ability.

Mr. Butler has told me much about the Conference and I doubt not that it was your speech which really stirred the feelings of the audience.

I shall be in Lucknow on 8th and I hope to see you whenever you come to Lucknow.

I heard to-day from Mr. Fayyaz Ali Khan, C. S. I. that he is writing to you to announce his intention to construct at his own expense a Boarding House at Aligarh M.A.O. College at a cost of Rs 20,000.

You now trust I am a sincere well-wisher of the college and require no assurance in this respect from me.

Yours sincerely,
(Sd.) J. W. LATOUCHE.

[P. 136]

NAWAB MOHSIN-UL MULK,
ALIGARH.

---

(17)

Extracts from the letter of S. H. Trevor.

CAMP AJMER DISTRICT,
24th Feb, 1887.

* * * * * *

I need not say that this impression is marked by your usual ability and courage and considering your position, experience and opportunities, is likely to receive close attention."

[P. 142]

---

(18)

HAWARDEN CASTLE,
Chester, 10th Dec., 1888.

Dear Sir,

To reply in full to your interesting letter would require a much longer and closer examination of many questions respecting India than is in my power to institute. The representative system has played a great and may yet play a greater part in the history of mankind. It is of Aryan and mainly Western origin, and in the opinion

کالج مذکور و طریقۂ بود و باش طلباء را هم ملاحظه کردم ، خیلے
موزون و درست است ۔ بعد ازان که اطفال اهل اسلام بعقائد
اسلامی ضروری فرائض اسلام دانسته شوند هرگاه شروع درس
مروجه یورپ را بکنند هیچ عیبے نیست ۔

سراج الملة والدین (دستخط اشرف)

(15)

Extracts from the speech of His Honour Sir James Digges Latouche.

* * * * * *

My second duty is to deliver to my friend the Honorary Secretary of the college the gold medal of the order of the Kaiser-i-Hind which has been conferred upon him by His Excellency the Viceroy of India. I need not remind you that this honour is paid only to those who have unselfishly served their generation and who have disinterestedly devoted themselves to the task of working for the good of India. I have watched the work done by Moulvi Syed Mehdi Ali Khan since the death of Sir Syed Ahmad Khan and I know how much the extraordinary growth of the college is due to his exertions, to his eloquence, to his unfailing tact and good sense. He has earned again for himself at Aligah the title by which we know him best-Mohsin-ul-Mulk, or benefactor of the country.

" ان الله يحب المحسنين ' [P. 134.]

(16)

My dear Sir, 4th January, 1935.

Mr. Tyler is replying to your letters of yesterday's date but I must send you a line myself to congratulate you very heartily on the great success you achieved at Rangoon and on the highly satisfactory result of the Educational Conference at Lucknow.

محتاجیم - سر ازین و با این هم - ما برائے همیشه همیشه ماهے پنج صد روپیه می دهیم و نصیحت ما خواهد بود که طلباء مسلمان اول همین قدر که امروز امتحان گرفتیم، اول همین قدر تعلیم دینی داده شود، بعد بهر طرف رو گردانند گردانید،

وحالا یکمشت "و ایک دم" که این سالانه نیست بست هزار روپیه می دهیم - ما می خواهیم که چند طلبائے این کالج به حبیبیه کالج روند و بعض طلبائے حبیبیه کالج درین جا بیایند - سلام

(مکرر) مسلمانان که در این جا حاضر هستند، همه را باامان خدا می سپاریم و وداع می کنیم، و حالا بجائے خود میرویم، و امشب با متولیان این کالج (ٹرسٹیان) که بست و پنج کس می باشند باهم نان میخوریم و می رویم - سلام [P. 128.]

(14)

سند عطیه شاه افغانستان

هوالله

(نشان محراب و ممبر)

بتاریخ یوم چهار شنبه غرهٔ ماه ذیحجة الحرام سنه ۱۳۲٤ھ مقدس مطابق شانزده ماه جنوری سنه ۱۹۰۷ع جهت ملاحظه علی گڑھ کالج آمدم - اگرچه از زبان بعضے مردم در باب شاگردان کالج موصوف شنیده بودم که در عقائد اسلامیه خود درست نمی باشند - اما خود من، بحضور خود و بزبان خود، از شاگردان کالج موصوف امتحان بعضے عقاید ضروری اسلام و مسائل نماز و روزه را گرفتیم - تمام سوالهائے مرا بطریق عقاید اهل اسلام جواب گفتند - و سرشتهٔ تعمیر

at Oxford and Cambridge has been adopted. At the same time athletics are not neglected, and in all Schools and Colleges there is much emulation in cricket and football. Undoubtedly such institutions must materially affect the formation of character in future generations. [P. 121]

---

(13)

تقریر هز مجسٹی امیر حبیب‌الله خان شاه افغانستان

جنوری سنه ۱۹۰۷ ع

اکثر مردم درباب این کالج قسم قسم سخن ها می گفتند لاکن ما آمدیم برائے علم آوری و ما شکر گزاریم از گورنمنٹ انڈیا که او اجازت داد این را که درین کالج که اکثر مردم اسلام که دراین جا آمده اند به بینم - حالا آمدم بر سر مطلب - امروز که ما آمدیم بقسم بسیار درست - و آنچه معلوم بود از اصول دین، ما سوال کردیم از شاگردان که درین کالج بودند، و شکر می کنیم - و باز شکر می کنیم که این شاگردان در عقاید اسلامی خود کامل و مکمل اند،

اول کسے که دهن بد گویان بزبان بند کند - او "من" خواهم بود - ما گاهے نه خواهیم گفت که کسے از علوم یورپ نخواند - بخواند و بخواند و بخواند - لاکن بعد تکمیل مسلمانی چنانچه خود ما در افغانستان یك کالج حبیبیه بنا کرده ایم، دروهم جاری کردیم علم مغرب زمین، لاکن بعد ازین که شاگردان "پورا" مسلمان شوند و این شاگردان که امتحان کردیم همه در اصول دین درست و کامل اند - لاکن ما افسوس می کنیم که ما امداد کالج مکمل درین جا کردن نمی توانیم، چونکه دردولت خود از برائی این کار

(11)

GOVERNMENT N.W.F.P. AND OUDH.
Naini Tal, 19th October, 1900.

Sir,

I have placed before the Lieutenant-Governor your letter of 15th October, enclosing a letter of 15th December, 1887, with regard to the recognition of the title of "Mohsin-ul-Mulk" conferred on you by His Highness the Nizam.

The Lieutenant-Governor asks me, in reply, to say that he is informed by the Government of India that the title which was conferred upon you when in the service of the Nizam ceased to be recognized in British India on your leaving the service of the Hyderabad State.

I am, Sir,
Yours faithfully,
Sd. JOHN O. MILLER.

(P. 105)

MAULVI MEHDI ALI KHAN,
ALIGARH.

I return the enclosure of your letter as requested.

---

(12)

Extracts from the speech of His Royal Highness The Prince of Wales and now His Imperial Majesty King George the V.

GUILD HALL,
London, May, 1906

* * * * * *

Having seen several colleges and other educational institutions in different parts of India. I gained some slight idea of the efforts that are being made to place within the reach of all classes a liberal education. Let me take as an example the great Muhammadan College and School at Aligarh, which is supported and controlled by the private enterprise of Muhammadan gentlemen from all parts of India. A residential system similar to that

even let me pay a quiet visit on my way home last spring. I am enjoying a pleasant time in England and return either next March or August and will be probably posted to Lahore. I wonder who will go as Viceroy. That grand old Badmash Gladstone is pretty sure to send the wrong man. He is doing all he can to ruin England. He is a curse to our country. Sir H. Normon declined to go because he could not undertake to carry out the line of policy laid down by Gladstone.

I shall be glad to hear of your welfare. Mrs. Marshall sends her kind remembrance to you and your wife.

Ever yours very sincerely,

[P. 71.] T. H. Marshall.

Note:—At places the words in the letter were illegible on account of the fact that white ant had scrapped it.

---

(10)

Private Secretary's Office
N.W.F.P. & Oudh.

Government House,
Nani Tal,
24th June' 1900.

To

Nawab Mohsin-ul-Mulk Bahadur,
Aligarh.

Dear Sir,

In reply to your letter of the 21st instant, I am desired by His Honour to say that it is quite unnecessary for you to give yourself the trouble of a journey to Naini Tal for the purpose of personally laying before His Honour your views on the Urdu-Nagri question, when a written communication will suit the purpose equally well.

I am,
Yours truly,
Gilug Bayley, Capt.,
Private Secretary.

[P. 97.]

(9)

11. CONNAUGHT SQUARE,
London.

15th September, 1893.

My dear Mehdi Ali,

I must write and tell you how surprised and sorry I was when I read in the newspapers about your leaving. I never thought that the Nizam would have been so ill advised and foolish as to part with you. I should sooner had expected that H. H. would himself had resigned then that you had had to leave! The..of Hyderabad are truly past-understanding. It was a bad day for the State when you left it. I consider that you have been unfavourably treated and I sympathise very sincerely with you. I was very badly treated and unfairly dealt with on all sides but my leaving the State was not the dire calamity which your departure is. I suppose that Mirza was at the bottom of it? He seems now to have full power and he has not used it wisely. Looking back to the days of 1887/88 who would ever have thought that the five men who then held power would have all gone. I refer to Salar Jung, you, myself, Hak and Mushtak. I do not count Mehdi Husen, he was *Jackal* to any Lion he could follow and was a ....turn coat who deserved.................come to grief he never had the courage of his opinion but was always ready to lick the boots of the man at the time on the crest of the wave of power. I hear that you are going to settle at Aligarh and I hope I shall see you when I pass through there next year—Chiragh Ali will not be able to replace you properly. I know of no man who can do it. Hyderabad will suffer from your absence. I am told that Agha Mirza is working to get Hak back. Is this true? I suppose Khurshid who has some influence with the Minister will manage to hold on? I should like to write the history of Hyderabad for the last six years. What ups and downs there have been! I don't suppose I shall ever see the place again : people would not

(7)

HYDERABAD-RESIDENCY.

15th December, 1887.

My dear Nawab,

With reference to previous correspondence regarding the title of Mohsin-ul-mulk conferred by His Highness the Nizam on Moulvi Mehdi Ali, I am desired to inform you that his Excellency the Governor-General in Council has been pleased to recognize the title in question which may accordingly be used in official correspondence, and in any future relations between Moulvi Mehdi Ali and British officials.

The Government of India have at the same time requested that the attention of His Higness' Government may be again drawn to the necessity for obtaining the permission of the Government of India before titles are conferred on british subjects by His Highness the Nizam.

Yours sincerely,

(P. 16) (Sd.) D. ROBERTSON.

---

(8)

Extracts from the letter of Mr. M. H. Durand foreign Secretary Govt. of India.

DARJEELING,

25th November, 1888.

* * * * * *

Everyone I think agrees that you did your work in England with admirable prudence and discretion, and fully justified the confidence placed in you.

I am very sorry to hear that your health is so bad. Hyderabad is not so rich in capable officials that your services can be easily spared. I hope you will be able to hold on sometime longer.

(P. 24)

GOVERNMENT HOUSE,
Simla, May 4.

My dear Sir,

It may perhaps interest you to know that His Excellency the Viceroy has read with very great pleasure your letter on the Mahomedans and the Russian advance, which has been reproduced by the *Times* from the columns of the *Bombay Gazette.* Such sound views based on such a comprehensive and accurate knowledge of facts, and put forward with so much clearness and logical cogency by an Indian Mahomedan, cannot fail to have some influence in dispelling the ignorance and antiquated prejudices which exist in certain quarters regarding the relations between the Government and the people of India. That an Indian Mussulman can spontaneously and conscientiously write a letter on the political situation which, if anonymous, might readily be mistaken for the production of a highly-educated, well-informed patriotic Englishman, is a significant fact well deserving of attention. To an impartial observer it must seem far more convincing than any abstract argument in favour of the liberal, enlightened policy of the British Government towards its Indian subjects—a policy which aims at founding the stability and strength of the Empire on the intellectual enlightenment, the national prosperity, and the genuine loyalty of all classes of the population.

Yours etc.,
D. MACKENZIE WALLACE,
Private Secretary to the Viceroy.

(P. 13)

MEHDI ALI, MOONEER NAWAZ JUNG,
Political and Financial Secretary to
H. H. the Nizam's Government,
Hyderabad.

(4)

Extracts from a letter, of the Hon'ble Sir Stewart Bayley, K.C.S.I. C.I.E.,

21st Sept. Bolaram.

* * * * * *

I found you when I came here one of the most responsible officials and most trusted advisers of the late Minister Sir Salar Jung, and I remember his telling me, that there was no one who gave him more unpalatable advice sometimes; but on whose honesty of purpose and soundness of judgment he could better rely.

I have never had reason to doubt the correctness of this view.

Of your administrative work in introducing the survey and settlement and in putting the revenue system of the country on an exact and stable basis, I can only say that you have therein rendered services to H. H's Government second only to those of the late Minister himself, and I regard the fact that under present trying circumstances, the daily work of administration both here and in the interior, goes on without any serious strain; as to a great extent due to your judgment, steadfastness and capacity.

I hope it will be long before your connection with the State is severed but when that time comes I trust the very remarkable services you have rendered to H. H.'s Government, and indirectly therefore to the British Government, will not fail to meet with due recognition.

Yours very sincerely,

S. C. Bayley.

(P. 6)

---

(5)

Extracts from the letter of S. C. Bayley.

Simla, 4th April.

* * * * * *

I am well aware of the excellent work you have done and of the great dependence placed on you by the late Minister and I am quite sure that in the interests of the Hyderabad state, it is very desirable that you should continue to assist the Government in supervising the revenue and the financial departments.

(P. 7)

in cultivation and ownership. This is necessary to maintain the record in the same accurate state as the settlement officer leaves it in. Great attention is now being paid to this subject in the Northern India, where the work is entrusted to the Putwaries and Kannugos working under the Agricultural Department. Without some such arrangement the record prepared at the time of survey becomes in course of time obsolete, and the whole operation has to be done *de novo* at much expense and harassment to the people. I dare-say you have some provision for this; if not, the matter is so important that I would suggest your bringing it to the notice of the Minister.

(P. 4)

Yours very truly,
(Sd). S.C. BAYLEY.

---

(3)

Extracts from the letter of

THE JUNIOR UNDER-SECRETARY TO THE GOVERNMENT OF INDIA.

To

THE RESIDENT AT HYDERABAD.

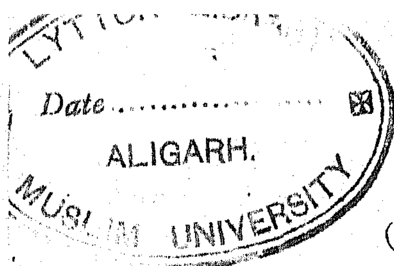
Foreign Department, Political.
Dated Simla, the 2nd Nov., 1882.

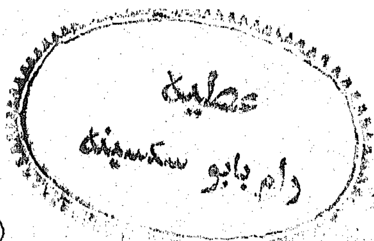
* * * * * *

2. The Governor-General in Council has read the Memorandum with interest, and I am desired to express his appreciation of the progress made in the Revenue Survey work in His Highness' Dominions which reflects much credit on Moulvi Sayed Mehdi Ali.

I have, etc.
(Sd). W. RIDGEWAY, Lieut.-Colonel,
Junior Under-Secretary
to the Government of India.

(P. 5)





(1)

INDIA OFFICE,
London,—28th Oct. 1882.

Extracts from the letter of Sir William Muir.

* * * * * *

"When I heard of your transfer to Hyderabad. I felt sure from my experience of your intelligence and ability in your office at Mirzapore that you would distinguish yourself in your new sphere.

I shall always be glad to hear from you, not only in respect of the revenue matters of Hyderabad, but also in all matters respecting the administration and especially the progress of Education,—especially female Education. (P. 4)

---

(2)

Extracts from the letter of the Hon'ble Sir Stewart Bayley, K.C.S.I., C.I.E.

Simla 7th October.

My dear Sir,

I am much obliged to you for your letter of the 20th September, and for your Memorandum on the work of the Revenue Survey Department. I delayed answering your letter till I should have time carefully to peruse the Memorandum. This I have done with much pleasure, there can be no doubt of the immense value of the work which you have initiated and brought well on its way to a successful issue. It is of course the foundation-stone of successful revenue administration, and you will have the satisfaction of knowing that in this respect Hyderabad is better off than the permanently settled province of Bengal, and not much behind the most advanced province of India. I do not notice in your Memorandum any provision made for recording from year to year the changes